نگار

قیمت ۸/

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سعہ)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۸	فہرست مضامین نومبر سنہ ۳۶ء	شمارہ ۵

ملاحظات ———— ۲

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث ———— عبدالمالک آروی ———— ۹

جھانسی کی رانی ———— ۲۶

مسئلۂ خلافت ———— ہرنام ———— ۳۶

انتقام ———— خواجہ احمد فاروقی بچھرایونی ———— ۴۶

باب الاستفسار ———— ۵۷

باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۶۲

چاند کا سفر ———— ۶۸

مطبوعات موصولہ ———— ۷۲

منظومات ———— رضوی۔ شمیم۔ صہبا۔ مخدوم محی الدین بی اے ———— ۷۷

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	نومبر ۳۵ء	شمارہ ۵

ملاحظات

ایک جدید عالمگیر مذہب کی ضرورت

اس وقت تمام مذہبی اقوام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو آزاد ہیں اور علوم و فنون، تجارت و صناعت، سیاست واقتصاد اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی یافتہ نظر آتی ہیں اور دوسری وہ جو غلام ہیں اور بجائے ترقی کے پستی کی طرف مایل۔ اول الذکر میں آپ مغربی اقوام کو لیجیے جو برائے نام عیسوی مذہب رکھتی ہیں اور موخر الذکر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اسلام کے پیرو ہیں اور نہایت شدت کے ساتھ۔

آپ اہل مغرب سے سوال کیجیے کہ اُن کی ترقی کا باعث کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں یہ کبھی نہ کہیں گے کہ اُن کی ترقی کا سبب ان کا مذہب ہے، لیکن ایک مسلمان ہمیشہ یہی کہیگا کہ اس کے زوال کا باعث صرف یہ

کہ اس سے عقاید مذہبی ضعیف ہو گئے ہیں۔

کسقدر عجیب بات ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کے سامنے ترقی کے باب میں مذہب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسری غیر ترقی یافتہ قوم مذہب ہی کو عروج و اقبال کا اصل سبب قرار دیتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور صحیح ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلطی پر ہیں، دونوں گمراہ ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی سچا نہیں، کیونکہ جس طرح اہل یوروپ کی موجودہ ترقی صحیح معنے میں ترقی کہلائے جانے کے قابل نہیں ہے، اسی طرح مسلمانوں کا یہ خیال کہ صرف مذہب کا عقیدہ ہی ترقی کا کفیل ہو سکتا ہے، یکسر وہم و خیال ہے، اگر مذہب سے مراد چند مخصوص حرکات و مراسم ہیں۔ قبل اس کے کہ اس باب میں کوئی تفصیلی گفتگو کیجائے، مذہب کی گزشتہ تاریخ اور تمدن کے موجودہ دور ترقی پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ان مذاہب کا کوئی ذکر نہیں جن کا تعلق انسان کے عہد دہشت سے ہے بلکہ ان مذاہب کو لیجئے جو الہامی و تاریخی مذاہب کہلاتے ہیں، جو صحف مقدسہ رکھنے کے مدعی ہیں اور غور کیجئے کہ ان کے صفحات تاریخ میں آپ کو کیا چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ غیر مذاہب والوں کے ساتھ جنگ و جدل، باہم گر عقاید کے ادنےٰ اختلافات پر خونریزی اور مذہب کے نام پر ملکی فتوحات اور سیاسی اقتدار کا قیام۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی بانیِ مذہب زندہ رہتا ہے اس کی تعلیم کی اصل روح بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کے مرنے کے بعد چند جانشین اُسی عزم و ثبات کے میسر آگئے تو کچھ زمانہ تک اصل تعلیمات کے اثرات باقی رہتے ہیں ورنہ مذہب نام رہجاتا ہے صرف اغراض ذاتی کی تکمیل کا، مختلف جماعتوں کے سیاسی نزاعات کا اور اُن تمام چالوں کا جو قیام ملوکیت و سلطنت کے لئے ایک قوم کو چلنا پڑتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تقریباً تمام مذاہب کا نصب العین قیام امن و سکون رہا ہے، لیکن صرف ایک محدود جماعت کے افراد میں، ایک مخصوص ملک و قوم کے اندر۔ تمام دنیا اور اس کی آبادی کا سوال کسی کے سامنے نہیں تھا اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا کیونکہ دنیا کے جغرافیہ، مختلف ممالک کے طبیعی حالات اور وہاں کی آبادی کے نفسیاتی رجحان سے وہ ناواقف تھے اور کسی ایسے قانون کی تدوین سے وہ مجبور تھے جو تمام نوع انسانی پر حاوی ہو سکے۔ اس لئے اگر عہد ماقبل میں کوئی مذہب تمام کرۂ ارض کی آبادی کو کسی ایک مرکز پر لانے اور ان سب میں باہم گر رشتۂ اخوت و ہمدردی پیدا کرنے سے قاصر رہا تو یقیناً یہ نہ مذہب کا قصور تھا اور نہ بانیِ مذہب کی تعلیم کی کمزوری، بلکہ ایک ایسی مجبوری تھی جس کا کوئی علاج ممکن ہی نہ تھا۔

اب اسی کے ساتھ عہد حاضر کی ترقیوں کی طرف نگاہ ڈالئے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علوم و فنون کی ترقی، تجارت و صنعت کی توسیع، اقتصادی مسایل کی بین الاقوامی اہمیت، ذرایع حمل و نقل

کی وسعت، مکاتبت و مخابرت کی آسانیوں نے اسوقت دنیا کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے ملادیا ہے اور اس وقت کوئی ملک ایسا نہیں جو کسی نہ کسی امر میں دوسرے ملک کا دست نگر نہ ہو، گویا اقوام عالم کا مفاد اس وقت ایک ایسا اجتماعی مسئلہ ہے کہ اس سے قطع نظر کرکے ہم تمدن و عمرانیت کی کسی گتھی کو سلجھا ہی نہیں سکتے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ باایں ہمہ ضرورت اتحاد و اتفاق، بے اعتمادی یا خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی مذہب، ایک ہی نسل کے لوگ اور ایک ہی مرز و بوم میں سانس لینے والے افراد مل جل کر نہیں رہ سکتے اور ہر وقت ایک ملک دوسرے ملک کو کھاجانے ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

عام امن و سکون کے قیام کے لئے ہیگ کانفرنس، مجلس اقوام اور تخفیف اسلحہ کی انجمن بروے کار آتی ہے لیکن جسوقت تک کوئی صورت رزم و پیکار کی پیدا نہیں ہوئی ان کے جلسے بھی ہورہے ہیں، بحث و گفتگو بھی جاری ہے، امن و سکون کی ضرورت پر تقریریں بھی ہورہی ہیں، جبر و تعدی کو دنیا سے محو کرنے کے لئے ہر قسم کی آمادگی ظاہر کی جارہی ہے، لیکن جب خرمن کے کسی گوشہ میں کوئی چنگاری پڑجاتی ہے، تو پھر آگ بجھانے کے بجائے ہر ملک اسی فکر میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ خرمن کی لوٹ میں سب سے بڑا حصہ اسی کو ملے۔ چنانچہ حال ہی میں جب جاپان نے چین پر دست درازی شروع کی تو مجلس اقوام کا وجود جس درجہ ناکارہ ثابت ہوا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور اب اطالیہ کے ظالمانہ اقدام پر مجلس اقوام جو کچھ کررہی ہے وہ بھی سب پر عیاں ہے۔

الغرض جس حد تک دنیا کے امن و سکون کا تعلق ہے نہ مذاہب عالم اس کے قایم کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہ تمدن جدید کی ترقیاں اس یوسف گم گشتہ کا کوئی سراغ لگا سکیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مذاہب کے سامنے عملاً تمام دنیا کے انسانوں کا قدرتاً کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوسکتا تھا اور اب جو اس کا امکان ہے تو مذہب کو بالکل علحدہ کردیا گیا ہے اور اس کی جگہ وطنیت و قومیت نے لیلی ہے، جو دنیا کے امن و سکون کے لئے اتنی ہی خطرناک چیز ہے، جتنا ایک مذہب والے کا دوسرے مذہب والے کو گمراہ و کافر کہنا۔

اس میں شک نہیں کہ تمدن انسانی اور ہیئت اجتماعی کے اخلاق پر کسی چیز کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا مذہب کا اور یہی سبب ہے کہ جب کسی مذہب نے کسی قوم کو اُبھارا تو اسے ہمدوش ثریا بنا کر چھوڑا اور جب گرایا تو زمین میں دفن کئے بغیر چین نہ لیا۔ اس لئے مذہب کو شامل کئے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ مذاہب عالم میں کونسا مذہب اس مقصد کے پورا کرنے میں ہمارا معاون ہوسکتا ہے۔ اسکا ایک مختصر جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ "کوئی نہیں" اور دوسرا یہ کہ "سب"۔ کیونکہ اگر تمام مذاہب کسی ایک خیال کو غرض مشترک قرار دیکر تمام نوع انسانی کے مفاد کو اپنے سامنے رکھیں اور لغو و فضول عقاید ترک کرکے آپس کے اختلافات کو مٹادیں تو سب کے سب ہمارے لئے مفید ہوسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ مذاہب کے موجودہ

مفہوم کے لحاظ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی لئے میں نے کہا کہ اس کا مختصر جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ "کوئی نہیں"۔

یہی وہ حقیقت ہے جس نے دنیا کو کسی نئے عالمگیر مذہب کے خیال کی طرف مایل کر رکھا ہے اور اس کی تشکیل کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

اس مذہب کا مدعا خدا سے انکار نہیں، بلکہ اس کا اقرار ہے، لیکن خدا اور اس اقرار کا مفہوم یقیناً کچھ اور ہے۔ خدا سے مراد کوئی ایسی مستبد ہستی نہیں جو خواہش دیدار کا جواب صدائے "لن ترانی" سے دے یا جس کا ادنیٰ سا جلوہ پہاڑوں کو خاک سیاہ کرکے رکھدے بلکہ ایک رحم و اُلفت والی ہستی سراپا لطف و احسان ذات جو ساری دنیا کو ایک خاندان، ایک عایلہ اور ایک ہی گھرانا بنانے میں ہمارا ساتھ دے اور جس کے نزدیک عبادت و عبودیت کا مفہوم سوائے "سماجی اخوت" کے اور کچھ نہ ہو۔ الغرض اس مذہب کا خدا وہ ہوگا جسے زردشتیوں نے ایک "محیط الکل روشنی" سمجھا، ہندوؤں نے "حقیقت عظمیٰ" جانا، پیروانِ کنفوشس نے "ترتیب و استقلال" سے تعبیر کیا، بودھ مذہب نے "دوامی سکون" میں تلاش کیا، اسلام نے "قدرت مطلقہ" کہا، یہودیت نے "تقدس محض" جانا اور عیسویت نے "محبت" کے نام سے پکارا۔۔۔ کہ۔۔۔ ان میں سے ہر تعبیر انفرادی و اجتماعی طور پر اسی ایک "صداقت" کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے جو اوہام و رسمیات سے قطع نظر تمام مذاہب کا تنہا مدعائے تگ و دو ہے۔

مذاہب کی باہمی جنگ کا سبب نہ خدا کی ذات ہے نہ اس کا تصور، بلکہ صرف یہ کہ جس نام سے ہم اُسے پکارتے ہیں دوسرا کیوں نہیں پکارتا اور جس طرح ہم اس کی یاد کرتے ہیں دوسرا کیوں نہیں کرتا۔ درانحالیکہ وہ سب نام ایک ہی ہستی کے ہیں اور وہ یاد ایک ہی ذات کی ہے۔ ہمارا اختلاف صرف اس بنا پر ہے کہ ہم نے اپنا خدا علحدہ علحدہ بنالیا ہے اور اس کی پرستشگاہیں مختلف شکل و صورت کی ہیں، ہم میں افتراق کا سبب حقیقتاً مذہب نہیں بلکہ ہماری لامذہبیت ہے۔ لامذہبیت عقاید باطلہ کی، اوہام خرافیہ کی، تفریق مسجد و کنیسہ کی، امتیاز ناقوس و اذان کی اور اس لئے اسوقت ضرورت ہے ایک ایسے عالمگیر مذہب کی جو اختلاف مٹا کر سب کو ایک مرکز پر لے آوے، جو سچا جذبۂ خلوص و صداقت پیدا کرکے نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک خاندان اور ایک قبیلہ سے منسلک کردے اور جو خدا کو اس صورت میں پیش نہ کرے کہ وہ پیشانی پر قشقہ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو جاتا ہے اور محراب مسجد میں اپنی آغوش کھولے بیٹھا رہتا ہے۔ الغرض ایک ایسا مذہب جس میں فردوس ہی فردوس ہو اور جہنم کا پتہ نہ ہو، جس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کسی کو کافر کہدینا ہو اور سب سے بڑا صواب خطاؤں کو درگزر کردینا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ایسے مذہب کو کیونکر مقبول بنایا جا سکتا ہے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے کونسا تعمیری پروگرام مفید ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں بہائی مذہب کے چند افراد نے ایک سوسائٹی نیو ہسٹری (عہد جدید) کے نام سے قایم کی ہے اور اس کا نصب العین صرف یہ ہے کہ وہ موجودہ اور آیندہ نسل کو ایک عالمگیر مسلک کے خیال سے آشنا کر کے مذاہب کی باہمی تفریق کو مٹائے اور دنیا میں امن و سکون کی حکومت قایم کرے۔

اس سوسائٹی نے ۱۹۳۵ء میں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت و تشکیل پر اپنے خیالات کا اظہار کریں، چنانچہ بہ کثرت مضامین موصول ہوئے اور ان کے مطالعہ کے بعد تین مقالے قابل انعام ٹھہرے۔

سب سے پہلا انعام ۳۰۰ ڈالر (تقریباً ایک ہزار روپیہ) کا، چین کی ایک نوجوان خاتون "مس لوئی ین ین چانگ" کو ملا، دوسرا انعام ۲۰۰ ڈالر کا ایک مدراسی نوجوان ٹی۔ ام۔ پی مہادیو کو دیا گیا، اور تیسرا انعام سو سو ڈالر کا دو آدمیوں کو ملا۔ ان میں سے ایک خاندیس کے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید ہیں اور دوسرے جاپان کے ایک عیسائی پادری۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مقالے سب کے سب نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن چینی خاتون نے چونکہ زیادہ ترعملی تدابیر پیش کی ہیں اس لئے ان کا ذکر اس جگہ غالباً زیادہ مناسب ہوگا۔

انھوں نے اس مسلک جدید کے مفہوم کو جن الفاظ میں متعین کیا ہے وہ یہ ہیں کہ:-

"ہم سب جو ایک ہی ماں جائے اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، ایک انسانی ڈماکریسی قایم کرنے کا عہد کرتے ہیں جس میں تمام قومیں، تمام ملتیں یعنی نوع انسانی کے تمام افراد بلاقید جنس و عمر شامل ہیں اور انسانی آبادی کی اجتماعی ترقی و بہبود، دنیا کے عام امن و سکون کے لئے متفقہ طور پر کوشش کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ ہم سب اور ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہوگا کہ وہ دنیا سے معصیت و عدوان جرم و بداخلاقی کے عنصر کو محو کرے اور سوائے محبت کے کوئی اور جذبہ دل میں پیدا نہ ہونے دے"

اس مسلک کو بروئے کار لانے کے لئے بعض ذرائع بھی خاتون مذکورہ نے بتائے ہیں۔ مثلاً

(۱) ایک مرکزی سوسائٹی قایم کی جائے جو مشتمل ہو ہر ملک و قوم ہر جماعت و طبقہ کے افراد پر اور جس کا ہر ہر فرد خوشنما طور پر پورے ایثار سے کام لیکر اس مسلک کی اشاعت کرے۔ اور اس مرکزی سوسائٹی کی شاخیں دنیا کے تمام ممالک میں قایم کی جائیں۔

(۲) سوسائٹی کے ماتحت ایسے مدارس کا قیام جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اسی مسلک کے

ماتحت کیا جائے اور ان کو اس جدید عالمگیر مذہب کا سچا پیرو بنایا جائے۔

(۳) ہر قبیلہ میں اس مذہب کا ماننے والا ایک خاندان تیار کرنا چاہئے، جس کے بچوں کو شروع سے مساوات کی تعلیم دیجائے اور انھیں دوسری قوموں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے اُٹھنے بیٹھنے کی طرف مایل کیا جائے۔

(۴) اس سوسائٹی کا پریس علٰحدہ ہونا چاہئے جو اخبارات وجرائد تصانیف واشتہارات کے ذریعہ سے اپنے مسلک کی اشاعت کرے۔

(۵) مشنری اُصول پر مختلف جماعتیں دنیا کے تمام حصوں میں روانہ کی جائیں تاکہ وہ اپنے اقوال وکردار سے سوسائٹی کے مقاصد کو لوگوں پر واضح کریں۔

(۶) نہ کسی مذہب پر حملہ کیا جائے اور نہ اس کے عقاید ومراسم پر اور بلاقید مذہب ومسلک سب کو اس سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت دیجائے۔

(۷) جہاں تک عقاید کا تعلق ہے صرف اس خیال کو پیش کیا جائے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ وہی ایک ذات خداوندی ہے خواہ اس کو کسی نام سے پکاریں۔

(۸) حکومت کے نظم ونسق اور اس کے قوانین میں ایسی تبدیلیاں کرائیں جو امتیازی حیثیت کو محو کرنے والی اور "انسانیت" کے اُصول کو قایم کرکے "حکومت متحدۂ کرۂ ارض" کی بنیاد ڈالنے والی ہوں۔

(۹) علوم جدیدہ کی طرف عام توجہ پیدا کرنا ضروری ہے، کیونکہ علم جتنا وسیع ہوگا، اتنا ہی "متحدہ انسانیت" کا دایرہ وسیع ہوگا۔

یہ ہیں وہ تدابیر جو مسٹر لوئی ین ین چانگ نے ایک عالمگیر مسلکِ اتحاد کے قیام کے لئے بتائی ہیں اور انکے مفید وکارآمد ہونے سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن میرے نزدیک سب سے پہلے اس سوسائٹی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ مختلف مذاہب کے علماء وسربرآوردہ لوگوں سے ملے اور ان سے یہ التجا کرے کہ وہ دوسرے مذاہب والوں کو کافر وگمراہ سمجھنا اور کہنا چھوڑدیں، کیونکہ جب تک ایک مسلمان، ہندو کو کافر کہتا رہیگا، جب تک ایک ہندو مسلمان کو ملکش کے نام سے پکارتا رہیگا، جب تک ایک عیسائی سوائے اپنے جملہ دیگر اہل مذاہب کو گمراہ سمجھتا رہیگا اس وقت تک اتحاد ممکن نہیں۔

انسان کے تمام اخلاق تابع ہیں اس کے عقاید کے اور جب تک عقاید میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو اخلاق کا بدلنا دشوار ہے۔ مسلمان کے دل میں جو نفرت ہندو کی طرف سے پائی جاتی ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ اسکے نزدیک وہ کافر وبُت پرست ہے۔ ایک ہندو مسلمان کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا بھی نہیں کھاتا کیونکہ اس کے عقیدہ میں وہ نجس وناپاک ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس جذبۂ نفرت واستکراہ کے ہوتے ہوئے وہ باہم اخوت وہمدردی کا

سلوک روا رکھیں گے اور روحوں کا یہ اختلاف تمدنی و معاشرتی تعلق کو کیونکر خوشگوار بنا سکتا ہے۔

ہندوستان کی تھیاسوفکل سوسائٹی بھی وہی مقاصد رکھتی ہے جو امریکہ کی اس سوسائٹی کا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے وہ زیادہ تر فلسفۂ مذہب سے متعلق ہے اور عام طور پر یہی محسوس کیا جاتا ہے کہ اس کا میلان ہندو مذہب کی طرف ہے۔ امریکہ کی اس سوسائٹی کو بروئے کار لانے والے ابھی بہائی مذہب کے پیرو ہیں اور ہر شخص کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ بہائی مذہب کی ترویج کے لئے کیا جا رہا ہے۔

ہر چند جس حد تک صرف مقاصد کا تعلق ہے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کس مسلک یا مذہب کی طرف سے ان کا اعلان ہو رہا ہے، بلکہ صرف یہ غور کرنا چاہئے کہ وہ کس حد تک مفید و کار آمد ہیں لیکن مذہب کا نام آجانے کی وجہ سے چونکہ دوسرے مذاہب والوں کی مذہبی عصبیت تحریک میں آجاتی ہے اس لئے میرے نزدیک یہ کام صرف ان لوگوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں ہیں اور اُصولاً تمام مذاہب کی عزت کرتے ہیں۔

اس ماہ کی اشاعت میں ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک آروی کا مقالہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہر چند صاحب موصوف پابندی کے ساتھ بزم نگار میں شریک نہیں ہوتے، لیکن جب ہوتے ہیں تو اس انداز سے کہ ہر شخص پکار اُٹھتا ہے:۔

لو وہ برہم زن ہنگامۂ محفل آئے

حقیقت یہ ہے کہ عبدالماجد صاحب اپنے ذوقِ تحقیق و شغفِ علمی کے لحاظ سے جس امتیاز کے مالک ہیں وہ ہمارے نوجوانوں کو بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ اور اس لئے صوبۂ بہار اُن کے وجود پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

ڈرامہ "جھانسی کی رانی" بھی اس ماہ میں ختم ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ ناظرین نگار نے کافی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا ہوگا۔

چند ماہ قبل میں نے عقاید مہدویہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اس کے جواب میں ایک صاحب مند وزئی مہدوی کا مضمون موصول ہوا تھا میں نے اسے اس لئے شائع نہیں کیا تھا کہ اول تو وہ غیر ضروری طور پر طویل ہے اور دوسرے یہ کہ میرے اصل اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن اب مہدوی جماعت کے متعدد افراد کے تقاضائے پیہم پر آیندہ دسمبر کے نگار میں اس کو شائع کر کے اپنی رائے پیش کروں گا۔

اگر کسی مضمون یا نظم کے ساتھ

جواب یا واپسی کے لئے ٹکٹ موصول نہ ہوں گے تو ناقابل اشاعت مضامین فوراً تلف کر دئے جائیں گے۔ — اڈیٹر

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

خاقانی کے کلام میں تصوف کا بھی گہرا اثر پایا جاتا ہے ہرچند صوفی شعرا عطار و رومی، عراقی و نظامی، کمال خجندی و اوحدالدین کرمانی ساتویں صدی اور اس کے بعد گزرے ہیں لیکن خاقانی سے پہلے صوفی شاعری کے دو بڑے علمبردار حضرت ابی سعید ابن ابی الخیر اور حکیم سنائی گزر چکے تھے، پھر بھی خاقانی کی شاعری پر ان کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا، شعرائے متاخرین عرفی و نظیری، ظہوری و بیدل، درد و غالب سبھی نے رومی و عراقی کے صوفیانہ رنگ تغزل کا تتبع کیا لیکن خاقانی کی غزلیات و قصاید کسی میں کوئی تقلیدی عنصر نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے رنگ میں جو کچھ اس کا کلام ہے وہ خود اس کے محسوسات کا نتیجہ ہے اور اس میں وہی بنیادی و اصولی سادگی ہے جو ابتداءً کسی صنف کلام میں پائی جاتی ہے وہی ترک طمع وہی عزلت و قناعت وہی وحدت و تجرید وہی موعظت و تزکیہ اسکے کلام میں بھی ہے جس کا نمونہ "حدیقہ" میں خاقانی سے پہلے موجود تھا اور جو آیندہ عطار و رومی کے یہاں کمال کو پہونچا ایک جگہ ترک طمع اور عزلت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

در جرم ماہ و قرصۂ خورشید منگرم　　　ہر گہ کہ دیدہ ہا شودم رہنمائے نان

یعنی شاعر "نان" کے بدلے چاند اور سورج کی نان ناصورت پر قانع ہو جاتا ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

نتواں در خط دہر خط وفا یافتن　　　نتواں بر سطح آب نقش قلم ساختن

یا پھر ان کا یہ فرمانا

از داغ دل بسوز و زمرہم اثر مجوئے　　　باخویشتن بساز و ز ہمدم نشاں مخواہ

غالباً یہ سب اس زمانہ کا کلام ہے جب وہ دربار سے الگ ہو کر عزلت گزیں ہو چکے تھے، خاقانی کے یہاں پرشوکت قصاید کی طرح المناک مراثی بھی ہیں خاقانی نے اپنے مراثی میں فاجعہ نگاری کے ساتھ شاعرانہ تمثیلات اور خیالی بلند پروازیوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اس کے مراثی میں بھی وہی رفعت خیال اور شوکت معنی موجود ہے جو اس کے قصاید میں ہے اور اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان مراثی کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے جذبات المیہ میں کوئی اُبھار نہ پاتے کیونکہ اس کے قصاید عموماً اشارات و تلمیحات کے باعث دماغ کو مشوش کر دیتے ہیں لیکن اس کے مراثی ایسے نہیں مثال کے لئے اس کا مشہور مرثیہ "ایوان مداین" پڑھ جائیے آپ نفس کے اندر ایک خاص گداختگی اور جذبات میں سرشاری پائیں گے، خاقانی کے "ایوان مداین" نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ آج یورپ میں اس کو علٰحدہ اصل کے ساتھ ترجمہ کر کے شایع کیا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاقانی کے "ایوان مداین" سے قبل فارسی میں کوئی نظم موجود تھی یا نہیں؟ اس سے قبل سنائی، معزی، عنصری بڑے بڑے شعرا گزر چکے تھے لیکن کسی کے یہاں "ایوان مداین" کے رنگ کی کوئی چیز نہیں ملتی، الغرض فارسی ادب میں خاقانی کی یہ نظم بالکل اچھوتی چیز ہے اور آج بھی فارسی زبان میں اس نوع کی آہنگ کا پتہ نہیں معلقات سبعہ کے ابتدائی اشعار ہمیں یقیناً "ایوان مداین" کی یاد دلاتے ہیں ہم امرء القیس کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل　　بسقط اللوی بین الدخول فحومل

ترجمہ:- اے میرے دونو دوستو! ٹھہیر دتا کہ ہم محبوبہ اور اس کی منزل کو یاد کر کے روئیں، وہ منزل جو مواضع دخول اور حومل کے درمیان ٹیڑھے ٹیلہ کے کنارہ ہے۔

اور بے اختیار ہمیں "ایوانِ مداین" کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

یکرہ ز سر دجلہ منزل بہ مداین کن　　وز دیدہ دوم دجلہ بر خاک مداین راں

یا پھر طرفہ بن عبد کا یہ شعر پڑھئے۔

لخولۃ اطلال ببرقۃ ثہمد　　تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید

ترجمہ:- سنگلاخ زمین میں "خولہ" کے (ویران) گھروں کی نشانیاں موجود ہیں یہ نشانیاں مہ جبینوں کے نازک ہاتھوں کے نیلگوں نقش و نگار کی طرح نظر آتی ہیں۔

اگر آگے چلکر امرء القیس "عنیزہ" کے ساتھ اپنی ہوس رانیوں کا عریاں مظاہرہ ذکرتا اور طرفہ اپنی محبوبہ "خولہ" کے حسن اور اس کے اُجڑے دیار کا تذکرہ کرتے کرتے اپنی ناقہ کی صفات نہ بیان کرنے لگتا تو ہم کہتے کہ "ایوان مداین" امرءالقیس اور طرفہ کے نقوش سے مستفاد ہے لیکن ایسا نہیں کہہ سکتے؟ اب آئیے غور کریں خاقانی نے یہ اسلوب نگارش کہاں سے سیکھا مصر جدید کا ایک مشہور فلسفی اور نقاد ادب ڈاکٹر زکی مبارک لکھتا ہے کہ نزول قرآن سے

پہلے شعراء کے یہاں عواطف اجتماعیہ (عام جماعتی رجحان) کا فقدان تھا ان کی شاعری میں اجتماعیت کے بدلے "فردیت" کا رنگ غالب تھا قرآن مجید نے عاد و ثمود و اقوام یونس و لوط وغیرہ اور ان کی ویران بستیوں کا تذکرہ کرکے ایک جدید موضوع تخیل پیش کیا اور اسی کے بعد سے شعراء کے یہاں "بکاء الممالک" مبحث شعر بن گیا چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں :-

کانت عواطف الشعراء عواطف فردیۃ لا اجتماعیۃ فکان الشاعر یبکی وجدہ ونعیمہ وہو یندب الرسوم و یتوجع للطلول، ولم یہتم العرب ببکاء الممالک والتفجع للشعوب اذکانوا فی بدایۃ الحیاۃ وکان الرجل منہم قلما یعنی بغیر نفسہ واہلہ وذویہ فکانوا فی شغل بانفسہم عن بلایا الانسانیۃ التی تصرخ من حولہم وہم عنہا غافلون۔

ثم جاء القرآن فسلک فی الحدیث عن الممالک البائدۃ مسلک التخویف والترہیب فلم یعطف علیہا بکلمۃ ولم یستر لہا عورۃ لان القرآن لم یکن کتاب شعر یرمی الی روعۃ الفن وجمال الخیال وانما کان کتاب حکمۃ وعظمۃ فکان من حقہ ان یقول بجزم ورزانۃ "اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم کانوا ہم اشد منہم قوۃ وآثارا فی الارض فاخذہم اللہ بذنوبہم وما کان لہم من اللہ من واق ذلک بانہ کانت تاتیہم رسلہم بالبینات فکفروا فاخذہم اللہ انہ قوی شدید العقاب" ولو لم یکن الزجر والردع من اغراض القرآن الاساسیۃ لکان لہ شان غیر ہذا الشان[۱]

شعراء کا رجحان ذاتی تھا اجتماعی نہ تھا شاعر اپنے عشق اور ایام راحت کا رونا روتا تھا وہ آثار (قیام محبوبہ) پر آنسو بہاتا اور (محبوبہ کے قرب وجوار) کے ٹیلوں کیلئے بیتابیاں کرتا لیکن عربوں کے یہاں جب وہ اپنی زندگی کے آغاز میں تھے ملکی بکا کا اہتمام نہ تھا اور نہ وہ قوموں کیلئے بیقراریاں کرتے اور ان میں شاذ و نادر ہی کوئی شخص اپنی ذات، اپنے لوگوں اور اپنی جماعت کے علاوہ کسی دوسرے کو در خور اعتنا سمجھتا، اور وہ اپنے ذاتی ہی تشغل میں معروف رہتے در انحالیکہ ان کے چاروں طرف انسانی مصیبتیں اور بلائیں چیخ رہی ہوتیں لیکن وہ ان سے غافل رہتے، پھر قرآن مجید نازل ہوا اور اس نے ڈرانے دھمکانے کے خیال سے قدیم ملکوں کا تذکرہ کیا اور نہ اس سے ادبراُدبر ہوا اور نہ اس کا نقص پوشیدہ کیا چونکہ قرآن شعر کی کتاب نہ تھا جو فن کی دلآویزی اور خیال کی خوبصورتی کو مد نظر رکھتا بلکہ وہ حکمت اور نصیحت کی کتاب تھا پس اس کا حق تھا کہ جو کچھ وہ کہے وثوق اور سنجیدگی کے ساتھ کہے۔ "کیا وہ زمین میں نہیں پھرتے تا کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے پہلے قوت اور آثار کے اعتبار سے زمین میں زیادہ بڑھے ہوئے تھے، پس اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو پکڑ لیا اور اللہ سے چھڑانے والا ان کا کوئی نہ تھا، یہ اس وجہ سے کہ پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے پس انھوں نے کفر کیا پھر اللہ نے پکڑا

[۱] "الموازنۃ بین الشعراء" مطبوعۂ مصر صفحہ ۱۲۷

اور وہ زور آور سخت عذاب والا ہے" اور اگر تنبیہ اور باز داشت (نہی عن المنکر) قرآن کے بنیادی اغراض میں نہ ہوتی تو اس کی شان اس شان سے مختلف ہوتی ۔

ہم عربی شعرا پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں خاقانی کے ایوان مداین کی طرح ابو عبادہ ولید بن عبید البحتری، (مولود ۲۰۶ھ) کا مشہور قصیدہ سینیہ نظر آتا ہے جو "ایوان کسریٰ" کے متعلق ہے، بحتری کا وطن "منبج" تھا جو حلب اور فرات کے درمیان ایک مقام ہے، عہد عباسیہ کا یہ مشہور شاعر اس درد انگیز اور والہانہ رنگ میں "ایوان کسریٰ" کی ویرانیوں اور آل ساسان کی بربادیوں کا رونا روتا ہے کہ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اتسلّی عن الحظوظ و آسی   لمحل من آل ساسان درس

ریحان شامی کی نکہت بیزیوں اور سرور و انبساط سے میں دل کو تسلی دیتا ہوں آل ساسان کی طرف سے محل میں ایک پیام روح مل رہا ہے۔

فلہا ان اعینہا بدموع   موقفات علی الصبابۃ حبس

اور یہ "تمنائے گریستن" یہیں ختم نہیں ہوتی، شاعر کے تاثرات حزیں "مکان" تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ "زمان" پر بھی یہی کیفیت مسلط پاتا ہے۔

لو تراہ علمت ان للیالی   جعلت فیہ ماتما بعد عرس

اگر تو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ راتوں نے اس ویران محل میں جشن و شادی کے بعد ماتم بپا کر رکھا ہے۔

بحتری نے اسی طرح بہت طویل قصیدہ لکھا ہے اور اپنے دردمندانہ احساسات اور انقلاب زمانہ کی مصوری کی ہے یہ تو اب مسلم ہو گیا کہ خاقانی نے اپنی نظم "ایوان مداین" کے نقوش یہیں سے لئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اس "نقش ثانی" میں اولیت کی طرح تخلیقی رنگ بھر دیا ہے اور پوری نظم میں کیفیات کی ایک دنیا سما گئی ہے، اس کی خاص وجہ تو خود فارسی زبان کی وسعت و حلاوت ہے اس پر شاعر کے انداز بیان اور شدت احساس نے اور بھی گرمی پیدا کر دی، انصاف یہ ہے کہ خاقانی کے بیان میں اس غضب کی اثریت اور والہانہ انداز ہے کہ قاری مسحور ہو کر بہا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے۔

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایواں را   تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی ز ایواں

دندانہ ہر قصرے پندے دہدت نو نو   پند سر دندانہ بشنو ز بن دنداں

گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنوں   گامے دو سہ بر ما نہ اشکے دو سہ ہم بفشاں

یہ ہے سحر حلال! شاعر خود سیلاب درد میں بہا جاتا ہے ایوان مداین کے در و دیوار سے اسکو عالم کی بے ثباتی اور زمانہ کی کم ارزی کا سبق مل رہا ہے ایوان فلک وش کے سرنگوں مینارے اس کو بخت کی نگوں ساریاں

یاد دلا رہے ہیں وہ دیوار جہاں کبھی زرکار پردے آویزاں تھے، وہ محل جہاں بلوریں قمقمے ضیا باریاں کرتے تھے، جہاں چمن دستہ تھا، ایک شہر خموشاں بنکر رہگیا۔

ایں ہست ہما ایواں کز نقش رخ مردم   خاک در او بودے دیوار نگارستاں
ایں ہست ہماں درگہ کو راز شہاں بودے   دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستاں

مطلب یہ ہے کہ ہر چند وہ غلامان زریں کمر کا ہجوم ہے نہ چاؤشان خوش پوش کا ہنگامہ، نہ باج گزار حکمرانوں کی جلوداریاں ہیں نہ وظیفہ خوار درباریوں کی حاضر باشیاں، ایک ہو کا عالم ہے ہر طرف حسرت برس رہی ہے لیکن پھر شاعر مصورہ پر زور دیتا ہے اور "سلسلہ درگہ" اور "کوکبۂ میدان" میں اس کو عہد ماضی کے مٹے ہوئے نقوش نظر آنے لگتے ہیں۔

پندار ہماں عہد است از دیدۂ فکرت بیں   در سلسلہ درگہ در کوکبۂ میداں

شاعر انگور کی بیلوں کو دیکھتا ہے سایۂ تاک میں انگور کے خوشے اور ان کے ارغوانی رنگ اس کو شراب ناب کی یاد دلاتے ہیں لیکن دیکھئے اسی بات کو وہ کس انداز حرمانی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

خون دل شیریں است آں مے کہ دہد رزبن   ز آب گل پرویز است آں خم کہ دہد دہقاں

شاعر انگور کے خوشوں کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے شاید اس میں شیریں کے دل کا خون پیوست تو نہیں وہ شراب کا خم دیکھتا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شاید پرویز کے عناصر جسمی نے برباد ہو کر پھر اسی خم کی صورت اختیار کر لی ہے حزیں ایک جگہ کہتے ہیں

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب   شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے دارد

حزیں مر کر پیمانہ بننے کی تمنا کرتے ہیں یہ اس توقع کی بنا پر شاید اس ذریعہ سے محبوب کے لب سے ان کا لب مس ہو جائے، حزیں کے یہاں ایک فریب خیال ہے ایک شاعرانہ التباس ہے، وہ طلسم آرزو میں بھٹک رہے ہیں خاقانی کی یاس ایک معنوی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے آخر میں وہ کہتا ہے،

بنگر کہ دریں قطعہ چہ سحر ہمی بارد   مشہوک مسیحی دل دیوانہ عاقل جاں

یہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاقانی کی یہ نظم "سحر حلال" کا درجہ رکھتی ہے اس کا ہر بیت ہمارے عضلات میں برانگیختگی اور روح میں بیداری و آگہی پیدا کر دیتا ہے۔

مصر جدید کے مشہور شاعر شوقی نے بھی رومہ کا مرثیہ لکھا ہے جبکہ وہ اسمٰعیل بک رافت کے یہاں پیغام لیکر گئے تھے، انھوں نے مغربی عالم مرجلیوث کو ایک قصیدہ لکھا، تونیل کی تعریف میں ایک پوری نظم لکھدی، اسی طرح انھوں نے اندلس کے قصر الحمرا پر بحتری کی تقلید میں ایک طویل نظم لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے عربی زبان

میں خاقانی کا سا زورِ بیان اور والہانہ انداز دکھایا ہے، وہ کہتا ہے۔

مشت الحادثات فی غرف الحمرا — مشی النعی بعد عرس
ہتکت عزۃ الحجاب وفضت — سدۃ الباب من کاسیر وانس
عرصات تخلت الخیل عنہا — واستراحت من احتراس وعس

وخطوط تکفلت للمعانی، — ولالفاظہا بازین لبس
وتری مجلس السباع خلاء — مقفر القاع من ظباء وخنس
لاالثریا ولاجواری الثریا — یتنزلن فیہ اقمار انس[1]

ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں بے اختیار خاقانی کے وہ ابیات یاد آجاتے ہیں جو سطور بالا میں لکھے گئے، خاقانی کی طرح شوقی بھی قصر کی ویرانگی سے پند لے رہے ہیں وہی دربانوں کی یاد اور قصہ خوانوں اور ندیموں کا رونا ہے، وہی سنسان دربار کی وحشت سامانی اور خدام و درباریوں سے اس کا خالی ہونا شوقی پر بھی اثر کر رہا ہے اگلی سطر میں خاقانی کہہ چکے ہیں۔

ایں ہست ہماں ایواں کز نقش رخ مردم — خاک در او بودے دیوار نگارستاں

اسی کے ساتھ شوقی کا یہ شعر پڑھئے۔

عرصات تخلت الخیل عنہا — واستراحت من احتراس وعس

اسی طرح سطور بالا میں خاقانی کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے جس میں اس نے "دندانۂ قصر" سے پند حاصل کرنیکا ذکر کیا ہے شوقی نے بھی "خطوط تکفلت للمعانی" کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مصری شاعر کے سامنے نہ صرف بحتری کا قصیدہ تھا بلکہ اس نے ایک حد تک خاقانی سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس صورت سے خاقانی نے عربی زبان کے اس احسان کی تلافی کر دی جو فارسی پر تھا،

---

[1] خلاصہ ترجمہ:۔ قصر حمرا کے بالاخانوں کو حادثات نے اس طرح روند ڈالا ہے جس طرح شادی بیاہ کے گھر میں موت ہو گئی ہو نہ حاجبوں کی گرم نگاہیاں باقی ہیں نہ شام کے وقت دوستوں کی منڈلی ہے نہ گپ شپ ہے میدان گھوڑوں سے خالی پڑا ہے نہ کوئی مرزبان ہے نہ نگراں۔ خطوط بہترین خوشنما لباس میں معنی کا اظہار کر رہے ہیں، بھیڑیوں (درندہ) کی مجلس ہرنوں اور گورخروں کا سنسان وادی بنکر رہ گئی، نہ تو یہاں عقد ثریا جیسی حسینان پریرو اور ان کی سہیلیاں باقی ہیں نہ پری پیکران قمر طلعت محو خرام ہیں۔ ع۔م

اثیر وخاقانی کے معارضات

اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ خاقانی شروان سے بیزار تھے، اور اہل شروان بھی ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ شعراء کی ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، یہ لوگ اس سے برہم تھے، مجازی اس کا معاند تھا، سلطان مغیث الدین ارسلان بن طغرل کے مداح اثیر کو بھی اس سے مخالفت تھی، اور حریفانہ جوششیں کیا کرتا تھا دولت شاہ نے تفصیل کے ساتھ ان معارضات پر روشنی ڈالی ہے اور خاقانی اور اثیر کے درمیان جن تعلی آمیز اشعار کا تبادلہ ہوا ہے وہ بھی نقل کیا ہے ملاحظہ ہو

به گردگار کہ دور زماں پدید آورد   کہ دور دور من است وزماں زماں من است
منم کہ یوسف عہدم به قحط سال سخن   کہ میزبان گرسنہ دلاں زباں من است
به شرق وغرب رود نامہ ضمیرم از آنکہ   کبوتر فلکی پیک رانگاں من است
زشاہ زخاقانی ہر ابلہے نہ ترسم از آنکہ   ہنوز در عدم است آنکہ ہمقران من است
منم بہ وحی معانی پیمبر شعرا   کہ معجز سخن امروز در بیان من است

خاقانی نے یہی قطعہ اثیر کے پاس بھیجا، اثیر نے بھی جواب میں یہ لکھ بھیجا،

گرہ کشائے سخن خامہ نوان من است   خزینہ دار رواں خاطر روان من است
کمان من نہ کشد دست وبازوئے شرواں   کہ تیر چرخ یک انداز ازکمان من است [1]

وفات

سطور بالا میں ان کی ولادت ووفات کے متعلق مفصل بحث ہو چکی ہے آتابک مظفر الدین قزل ارسلاں کی مدح کے سلسلہ میں خود لکھتے ہیں۔

کردند ہمہ حکم کہ در پانصد وہشتاد   اعجاز بدست آوری ور دم کشائی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۰ھ کے قریب وہ زندہ تھے، اور تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ۵۷۶ھ میں انھوں نے وفات کی، بہرحال شروان میں پیدا ہوئے اصفہان میں نشو ونما ہوئی، تبریز میں وفات پائی اور یہیں بمقام "سرخاب" دفن ہوئے، دولت شاہ لکھتے ہیں:-

"ومرقد او الیوم مشہور ومقرراست وافضل الزمان ظہیر الدین طاہر بن محمد فاریابی وملک الشعراء شاہپور بن محمد اشہری، نیشاپوری ہر دو در پہلوئے خاقانی است"

---

[1] "تذکرہ دولت شاہ" کے قلمی نسخہ میں جو پٹنہ لائبریری میں ہے کتابت کی بعض سخت غلطیاں پائی جاتی ہیں اثیر نے بھی خاقانی کے ہر شعر کا جواب دیا ہے لیکن نسخہ ہذا میں اکثر ابیات غلط درج ہیں اس لئے یہاں اس کا موقع نہیں کہ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کرکے پورا قطعہ لکھا جائے۔

ظہیر فاریابی کے متعلق تو اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے لیکن اشہری نیشاپوری کے بدلے صاحب "صحف ابراہیم" نے سید ذوالفقار ذہبی کا نام درج کیا ہے، بہرحال خاقانی کی قبر "ابعاد ثلاثہ" کی حیثیت سے اور بھی یادگار زمانہ ہے۔

خاقانی کے قصاید کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ نجوم میں یدطولیٰ رکھتا تھا اور اس نے باضابطہ اس فن کی تکمیل کی تھی چنانچہ نظرات سیارگان، قرآن سبعہ سیارہ، خصایص و اثرات کواکب، عروج و ہبوط انجم، ماہیات و اشکال بروج پر اس نے مختلف پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔

قران سبعہ سیارہ

۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء نے عام و خاص تمام نگاہوں کو علی قدر مراتب حوادث فلکی اور اثرات کواکب کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اخبار و جراید میں اس موضوع پر بیشمار مقالات شایع ہو چکے ہیں اور فنی اور خیالی حیثیت سے بہت کچھ اس پر طبع آزمائیاں کی گئی ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ کئی ہزار سال کے بعد قران سبعہ سیارہ ہوتا ہے چنانچہ حادثہ مہابھارت میں بھی اسی طرح سات ستاروں کا اجتماع ہوا تھا، اور ملک کو بے شمار حادثات و مصائب سے گزرنا پڑا تھا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس قران سبعہ سیارہ کے لئے ہزاروں برس کی طول مدت درکار نہیں بلکہ ایک صدی کے درمیان بھی اسی طرح قران ہوا ہے۔

خاقانی نے چھٹی صدی کے وسط یا آخر میں اپنے قصیدہ میں قران سبعہ سیارہ کے متعلق کافی روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعد انوری ساتویں صدی میں بھی اسی طرح قران کے باعث خطرات و مصائب سے خوفزدہ تھا انوری کے متعلق روضتہ الصفا کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چند کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی، اور انوری کا خطرہ محض خیالی تھا لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس عہد کے منجموں نے فنی حیثیت سے حکم کیا تھا کہ قران ہوگا اسی طرح حمداللہ مستوفی نے تبریز کے سلسلہ میں جو واقعات درج کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک یا دو صدی کے درمیان برابر کوئی مصیبت آسمانی نازل ہوئی ہے، خاقانی کہتا ہے

هفت رخشان مه آبان بهم آیند چه باک کہ سعود از مه آبان به خراسان یابم
بست و یک راه قران است به میزان همه را من همان لهو ز میزان به خراسان یابم

یعنی منجموں نے حکم لگایا ہے کہ برج میزان میں سبعہ سیارہ کا قران ہوگا اور اس وجہ سے روم و خجند اور ایران تمام طوفان اور گرہن سے آفتیں برپا ہوں گی، خاقانی اس وقت خراسان کا تہیہ سامان کئے ہوئے تھے وہ اس منجمانہ حکم کار د کرتے ہیں اور خراسان کو ان آفات و خطرات سے مامون بتا رہے ہیں۔

نکنم باور کا حکام خراسان اینست گرچہ صد ہرس دهقان به خراسان یابم

حکم بو معشر مصرع نگیرم گرچہ ۔۔۔ نامش ادریس رصد داں بہ خراساں یابم[۱]

مطلب یہ ہے کہ ہرمس (یونانی حکیم) اور لقمان جیسے سیکڑوں منجم متفقہ فیصلہ کردیں اور ابو معشر کو حضرت ادریس کی سی استعداد فلکیاتی حاصل ہوجائے جب بھی خراسان کے باب میں مجھے اس منجمانہ حکم کا یقین نہ ہوگا۔

محمد بن خوندشاہ طغرل بن ملک ارسلان کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

در زمان دولت او سبعہ سیارہ در اوایل میزان کہ از بروج ہوائی است در یک دقیقہ قران کردند منجمانہ گفتند کہ دریں سال بادے پیدا شود کہ عمارتہا خراب کند بلکہ جبال سختۃ البنیان از زمین برگیرد، و انوری دریں باب از سائر ارباب نجوم مبالغہ بیشتر داشت مردم از بیم جان در زیر زمیں ساختند و سردابہا پرداختند و بحسب اتفاق دراں ایام کہ اوقات حکم ایشاں بود چنداں باد نہ وزید کہ خلق رفع محصول نمایند[۲]۔

چنانچہ اسی پر اس عہد کے ایک شاعر نے طنزاً کہا

گفت انوری کہ از سبب بادہائے سخت ۔۔۔ ویراں شود عمارت و کہسار برسری

در روز حکم او نہ وزید است ہیچ باد ۔۔۔ یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

لیکن محمد بن خوندشاہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر چند تمام لوگوں پر ارباب نجوم کا جھوٹ ظاہر ہوگیا لیکن اسی سال تاتاریوں کے فتنہ اور چنگیز خاں کی بربریت نے دولت خوارزم شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور بالخصوص خراسان میں نہ تو کسی مکان کا مکین رہا اور نہ کسی گھر سے دھواں نکلا تعجب ہے کہ خاقانی اور انوری کے درمیان تقریباً دو سو سال کا فرق ہے، اور قران سبعہ سیارہ دونوں کے زمانہ میں میزان ہی میں ہوا اگر صاحب روضتہ الصفا انوری کے متعلق طنزیہ شعر نقل نہ کرتے تو کہا جاتا کہ یہ واقعہ خاقانی کے عہد کا تھا جس کو انوری کی طرف منسوب کرنے میں مورخ سے تسامح ہوگیا لیکن مرقومہ بالا شعر کی موجودگی میں تو اس کی بھی گنجایش نہیں رہی۔

برج میزان چونکہ "بادی" ہے اس لئے انوری نے "صرصر آتیہ" کی پیشین گوئی کی تھی جنوری ۱۹۳۴ء میں قران سبعہ سیارہ برج جدی میں ہوا تھا اور جدی خاکی ہے اس لئے زمین پر یہ آفتیں برپا ہوئیں زلزلہ آیا قصرو کوشک سرنگوں ہوئے اور "شمالی بہار" جو "گلشن ہند" تھا مساکن عاد و ثمود بنکر رہگیا۔

---

[۱] یہ وہی "ہرمس" (Hermes) ہے جس کی کتاب "مفتاح النجوم" کا ایک عربی ترجمہ مخطوطہ ۱۲۵ھ "میلن" (Milan) کے کتب خانہ میں موجود ہے ابو معشر کی زیچ بقول امیر علی فلکیاتی معلومات کا ماخذ رہی ہے، ابو معشر کو یورپ والے (Albumazar) کہتے ہیں۔ [۲] روضتہ الصفا

خاقانی نے بعض دوسرے قصاید میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصاید کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں فرماتے ہیں۔

کاندر سنہ ثول اختر سعد   در طالع کامراں بہ بینم
شش سال دگر قران انجم   در آذر و مہرگاں بہ بینم
ہر ہفت رسد بہ برج میزان   بالست و یکش قران بہ بینم
کیوان بہ کنارہ بینم ارچہ   ہر ہفت بہ یک مکاں بہ بینم
گر خطۂ شمال خسف گیرد   زیں کمہ روم اماں بہ بینم

ان ابیات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۵۵۳ھ میں مشتری (اختر سعد) برج اسد (طالع کامراں) میں ہوگا اور چھ سال تک برج قوس اور برج میزان میں قران رہیگا ساتوں ستارے برج میزان میں ۲۱ درجہ پر جمع ہوں گے، گو زحل (کیوان) کنارہ پر ہے لیکن ایک برج میں اجتماع ہونا ہی کیا کم ہے منجموں نے حکم لگایا ہے کہ خراسان میں گرہن لگیگا۔ لیکن کرہیں اماں رہیگا، اس کے بعد خود فیصلہ کرتا ہے۔

حقا کہ دروغ داستانیست   بطلانی داستاں بہ بینم

دوازدہ بروج

جلال الدین اختسان شاہ کی مدح میں کہتے ہیں

در برہ مریخ گرزگاو افریدوں بدست   وز مجرۂ شب درفش کاویان انگیختہ
پنبہ زارے بر فلک بے آب کیواں بہر آں   دلو را از پنبہ زارش ریسمان انگیختہ
سازآں دعنائے صاحب بربط اندام چرخ   سوز ازاں قراء صاحب طیلساں انگیختہ
چشم بز غالہ براں خوشہ کہ خرمن کردہ شب   داس کز دنداں ز راہ کہکشان انگیختہ
نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس   یا دو پیروج الصنم از یک مکان انگیختہ
نور بہ سرطاں ماندہ تا معجون سرطانی کند   زانکہ معلول صفرا از رخان انگیختہ
مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست   آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ
بخت بر زہائے انجم و ترازوئے فلک   نام نقش اختسان کامران انگیختہ

خاقانی نے ان ابیات میں بروج اور سیاروں کے متعلق استعارات و تشبیہات کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے بروج اور سیاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جس اسلوب جمیل کے ساتھ اس نے گریز کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے آیئے اب ہر شعر کے معنی پر غور کریں۔

در برہ مریخ گرزگاو افریدوں بہ دست   وز مجرہ شب درفش کاویان انگیختہ

خاقانی نے جس خوبی کے ساتھ خرافیات و مذہبیات، فلسفہ و تاریخ کے میدانوں سے خوشہ چینیاں کی ہیں اس کی نظیر کسی اور فارسی شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی، وہ اس روانی اور بے تکلفی کے ساتھ تلمیحات پیش کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے بیک وقت مختلف علوم کے مضامین کی طرف کیونکر اس کا ذہن منتقل ہو جاتا تھا اس سے اسکی سرعت ذہن اور اتقان حافظہ کا پتہ چلتا ہے وہ اس آزادی کے ساتھ دقیق سے دقیق علمی اشارے کرتا ہے کہ قاری کا ذہن بعض اوقات مشوش ہو جاتا ہے وہ جو کچھ لکھتا ہے اس وثوق کی بنا پر کہ سارا عالم گوش شنوا، اور دیدہ بینا رکھتا ہے درانحالیکہ اس کی دقت بیانیاں بہتیرے مستعد ارباب ذوق کو بھی بہت زیادہ پریشان نظر اور آشفتہ خیال بنا دیتی ہیں اگر سرسری طور پر ابیات بالا کا جایزہ لیجئے، فوراً ملٹن کی "فردوس مفقود" آپ کی نظروں کے سامنے آجائے گی، گرز گاؤ افریدون، درفش کاویان، قرا صاحب طیلسان، یبرج الصنم، معجون سرطانی یہ تمام فقرے ملٹن کے بدایع نگارش کی طرف ذہن منتقل کر دیتے ہیں۔

خاقانی نے یہاں "برہ" سے "برج حمل" مراد لیا ہے "گرز گاؤ" فریدوں کا مشہور حربہ تھا جس کی شکل گائے کے منھ کی طرح تھی، شیواجی کا "گاؤ مکھ" شاید اسی ایرانی حربہ کی نقل ہوگا "مجرہ" کہکشاں کو کہتے ہیں "درفش کاویان" ایرانیوں کا مشہور علم ہے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ سیارہ مریخ برج حمل میں گرز گاؤ لیکر آیا اور رات نے کہکشاں نہیں نکالی، بلکہ "درفش کاویان" کا پرچم پھیلا رکھا ہے مریخ کو کتب نجوم میں جوان غصہ ور خونی مزاج بتایا جاتا ہے۔

پنبہ زارے بر فلک بے آب و کیواں بہر آں
دلو را از پنبہ زارش ریسمان انگیختہ

یعنی آسمان بہ منزلہ پنبہ زار ہے، ایک ایسا پنبہ زار جہاں پانی اور کنواں ناپید ہے اسی لئے برج دلو اس پنبہ زار میں آبیاری کی خدمتیں انجام دے رہا ہے، برج دلو کی شکل یہ ہے کہ ایک عورت ہے جو ڈول رسی لیکر آب کشی کر رہی ہے۔

سازِ آں رعنائے صاحب بربط اندر بام چرخ
سوز از ان قرا صاحب طیلسان انگیختہ

"رعنائے صاحب بربط" سے سیارہ زہرہ مراد ہے، "قرا صاحب طیلسان" سے مشتری کی طرف اشارہ ہے۔ سیارہ زہرہ کے متعلق تو مشہور ہے، کہ ایک مغنیہ تھی جو ہاروت ماروت سے اسم اعظم سیکھکر ستارہ بنگئی اور آسمان پر چگی، "مشتری" کو قاضی فلک کہتے ہیں اسی لئے "صاحب طیلسان" لائے، چونکہ اگلے وقت قاضی خطیب اور مذہبی پیشوا جسم پر ایک چادر ڈالے رہتے تھے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک مطربہ کی لحن نوازیاں کسی دل والے قاضی یا مذہبی پیشوا کے اندر "ہاؤ ہو" پیدا کر دیتی ہیں اسی طرح بام آسمان پر سیارۂ زہرہ کی بربط نوازی اور موسیقیت سے قاضی فلک (مشتری) کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو رہا ہے۔

چشم بزغالہ بہاں خوشہ کہ خرمن کردہ شب   داس کردندان زراہ کہکشاں انگیختہ

"بزغالہ" سے برج جدی مراد ہے، خوشہ سے برج سنبلہ کی طرف اشارہ ہے، داس تو عموماً اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے گھاس وغیرہ کرتے ہیں (یعنی ہنسیا) لیکن "داس" ایک دوسرے معنی میں بھی آتا ہے گیہوں اور جو کے ہر دانہ کے سرے پر ایک باریک سا "کھر" ہوتا اسی کو داس کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ برج جدی جو بکری کا بچہ ہے "خوشہ" یعنی برج سنبلہ کو بہ نظر طمع دیکھ رہا ہے اس خوشہ کو رات نے خرمن کیا ہے، اور وہ بزغالہ کہکشاں کی راہ سے اپنا دانت خوشہ کے ہر دانہ کی باریک ٹہنیوں پر جمائے ہوئے ہے۔

نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس   یا دو بیروج الصنم از یک مکان انگیختہ

برج جوزا کی شکل یہ ہے کہ دو انسان باہم لپٹے ہوئے ہیں "بیروج الصنم" ایک قسم کی گھاس ہے، جو ختن و بلخ، لیتا و تبت وغیرہ میں پیدا ہوتی ہے اس کی شکل انسان کی سی ہوتی ہے شعر کے معنی یہ ہیں کہ برج جوزا کیا ہے گویا ایک بادام کے دو دانے ایک چھلکے میں ہیں یا دو بیروج الصنم ایک ہی مقام میں اُگے ہوئے ہیں۔

خور بہ سرطان مائدہ تا معجون سرطانی کند   زانکہ معلول است صفرا از رخان انگیختہ

اگلے زمانہ میں علم و ادب کے ساتھ ارباب ذوق طب کی تحصیل بھی لازمی جانتے تھے، چنانچہ اکثر ائمہ و شعرا نے بر بنائے تفنن یا اضافۂ معلومات کی نیت سے طب کی تحصیل کی، ابن حبان، سیوطی، اور رازی جیسے ائمہ مذہب اور رکنائے کاشی، حزیں، اور مومن خاں جیسے شعرا نے بھی باضابطہ اس فن کی تکمیل کی، خاقانی نے جس روانی کے ساتھ طب کے متعلق فنی اشارے کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ فن بھی سیکھا تھا اگلے سطور میں اسکا وہ شعر لکھا جا چکا، جس میں اس نے "عرق عراق" اور "شریان شروان" کا استعمال کیا ہے اس شعر سے جہاں علم الابدان سے اس کی واقفیت کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں معانی کے اعتبار سے ایک بلاغت جمیل بھی پائی جاتی ہے صنایع و بدایع میں اس کو تجنیس ناقص کہا جاتا ہے اسی طرح اس کا مرقومہ بالا شعر بھی اس کی طبی واقفیت پر دال ہے سرطان کے ساتھ "معجون سرطانی" کا استعمال "عرق عراق" اور "شریان شروان" کی طرح تجنیس میں داخل ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب برج سرطان میں داخل ہوا تاکہ "معجون سرطانی" تیار کرے، معجون سرطانی ضعف رجولیت وغیرہ کے لئے مفید ہے۔

مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست   آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ

ماہی سے مراد "برج حوت" ہے "تیر" سیارۂ عطارد کو کہتے ہیں "کمان" سے "برج قوس" کی طرف اشارہ ہے برج حوت مشتری کا گھر ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری نے مچھلی کا شکار کیا ہے اور اس کے پاس کمان تھی، تیر کی آفت ترکمان کی کمان سے برپا ہے "ترکمان" سلجوقیہ کی ایک شاخ ہے،

یہ لوگ بڑے تیرانداز ہوتے ہیں اور برابر تیر و کمان اپنے ساتھ رکھتے ہیں مصرعہ ثانی کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ ترکمانوں کی قدر اندازی نے آفت بپا کر رکھی ہے دوسرے یہ کہ "تیر" (سیارۂ عطارد) کو "کمان" (برج قوس) میں وبال ہوتا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں کمان یعنی برج قوس ہے اور دوسرے میں ماہی (یعنی برج حوت) مشتری دونوں برجوں کا مالک ہے اور اپنی کمان سے عطارد کو وبال میں ڈال رکھا ہے کتب نجوم میں برج قوس کی تصویر یہ ہے کہ جنگلی گائے کے مثل ایک جانور ہے اس پر ایک نیم مرد سوار ہے اور اس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہے اژدہا کی شکل کا ایک حیوان اس مرد پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور وہ مرد اس کو تیر مار رہا ہے۔

بخت بر زرہائے انجم در ترازوئے فلک — نام نقش اخفستان کامران انگیختہ

ترازوئے فلک سے "برج میزان" مراد ہے یعنی اخفستان شاہ ایسا کامران بادشاہ ہے کہ قسمت نے برج میزان میں ستاروں کو تولا اور سکہ بنایا اور اس پر اخفستان شاہ کا نام نقش کر دیا۔

آفتاب کا داخلہ بروج اور اختلاف موسم

قدیم زمانہ سے آفتاب کے سکون و حرکت کا مسئلہ انسانوں کے زیر بحث رہا ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں انغزاغورس نے یہ رائے دی کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے لیکن یہ خیال مناظر کے اعتبار سے اسوقت ذہن انسانی کے لئے ناقابل قبول ثابت ہوا، لوگ اسی ظاہری مشاہدہ پر قایم رہے، کہ آفتاب کو حرکت ہے یہاں تک کہ بطالسۂ مصر میں ایک بہت بڑا ماہر فلکیات پیدا ہوا اس نے نظام شمسی، اجرام سماوی اور جغرافیہ طبعی پر مختلف کتابیں لکھیں، بطلیموس کا نظریہ یہ تھا کہ آفتاب ہی متحرک اور زمین ساکن۔ ہے چنانچہ اسی نظام کے اصول پر اسلامی ہیئت دانوں، ابو معشر، البطانی (جس کو بطلیموس عرب کہا جاتا ہے) البیرونی وغیرہ نے اپنی کتابیں لکھیں لیکن آخر میں کوپرنیکس پیدا ہوا اور اس نے نظام بطلیموس کی تردید کر دی، اور انغزاغورس کی رائے تسلیم کی۔

خاقانی نے اسی نظام بطلیموس کے مطابق آفتاب کی حرکت اور داخلہ بروج پر شاعرانہ روشنی ڈالی ہے اس کے ایک طویل قصیدہ کا ایک حصہ یہ ہے

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری — عالم فاقہ بردہ را توشہ دہد توانگری
مایدہ ساز داز برہ بر صفت توانگراں — بذر گری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری
موسیٰ و سامری شود گاو برہ بہم ورد — آب خضر برآورد ز آئینہ سکندری
بنگہ ترازو شود روضہ صفت بہ تازگی — خرگہ ماہ از و شود خلد وش از منوری
چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد — روئے زمین شود ز تف پشت پلنگ بربری

تیز تر از کبوترے برج بہ برج می پرد | بیضۂ زر ہمی نہد در بدر از سبک پری
ہر سرمہ بہ برج نوبچہ نو بر آورد | یکرہ برج از و شود قصر دوازدہ دری
از ہمہ کشتِ فلک دانہ خوشہ خورد و بس | چوں سوئے برج خوشہ رفت از سر برج آذری
از سرِ خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو | کرد رگ گلوش را از سر داس نشتری
گوئی ازاں رگ گلو ریختہ اندر رزاں | انیہمہ خون کہ می کشند آتشی و معصفری

ان ابیات میں خاقانی نے آفتاب کے داخلہ بروج اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے آیئے ہر شعر کی مختصراً وضاحت کی جائے۔

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری | عالم فاقہ بردہ را توشہ دہد تونگری

اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو ایک کسان سے تشبیہ دی ہے، جس طرح ایک کسان مہینوں محنت اور دداودوش سے کام لیتا ہے اور اپنی جاں فشانیوں کے بعد دنیا کی فاقہ مستیاں دور کرتا ہے اسی طرح آفتاب بھی مہینوں ایک برج سے دوسرے برج میں مارا مارا پھرتا ہے تاکہ عالم کے لئے سامان رزق مہیا کرے چنانچہ آفتاب جب برج حمل میں آتا ہے تو بہار کی نشاط آفرینیاں ہوا کرتی ہیں اور جب وہ برج قوس میں آتا ہے تو خزاں کی ویرانیاں رہا کرتی ہیں۔

مایدہ سازد از برہ بر صفت تونگراں | بزرگری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری

یعنی جس طرح ایک امیر آدمی بھیڑ وغیرہ ذبح کر کے مہمانوں کی دعوت کرتا ہے اور کسان لوگ گائے کے ذریعہ خرمن کرتے ہیں اسی طرح آفتاب بھی برج حمل (برہ) میں آکر امرا کی طرح اہل دنیا کی ضیافت کرتا ہے اور برج ثور (گاؤ) میں جب آتا ہے تو زراعت پیشہ کی حیثیت سے غلہ کا خرمن تیار کرتا ہے۔

موسیٰ و سامری شود گاؤ و برہ بہ پرورد | آب خضر بر آورد ز آئینۂ سکندری

یعنی جس طرح موسیٰ بکریاں چراتے تھے، اور "سامری" نے "عجلاً جسداً" (بچھڑا) کی پرورش کی تھی اسی طرح آفتاب برج حمل و ثور (گاؤ برہ) کی پرورش کرتا ہے اور آسمان (آئینہ سکندری) سے مینھ برساتا ہے۔

بنگہ تیر از و شود روضہ صفت بہ تازگی | خرگہ ماہ از و شود خلد وش از منوری

"تیر" فارسی میں سیارۂ عطارد کو کہتے ہیں "بنگہ" کے معنی رہنگاہ "بنگہ تیر" کنایۃً برج جوزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے "خرگہ ماہ" سے برج سرطان مراد ہے شعر کا مطلب یہ ہے، کہ اب جوزا کی نضارت آگینی اور چمن سامانی اور سرطان کی خلد وشی اور نور پاشی شروع ہوتی ہے۔

چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد | روئے زمیں شود ز تف پشت پلنگ بربری

"دہان شیر" سے برج اسد مقصود ہے "پلنگ بربری" صحرائے افریقہ میں ایک قسم کا سیاہ شیر ہوتا ہے یعنی آفتاب جب برج اسد میں آتا ہے تو زمین حرارت اور خشکی کی وجہ سے بربری شیر کی طرح سیاہ ہو جاتی ہے۔

تیز تراز کبوترے برج بہ برج می پرد بیضۂ زرہمی نہد در بدر از سبک پری

کوئی خاص معنی نہیں اوپر "ماہ بماہ" والے بیت میں یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں لیکن اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو کبوتر سے تشبیہ دی ہے، اور جس طرح اگلے ابیات میں کسان اور زراعت کی مثالیں دیکر آفتاب کے فیوض و افادات کا تذکرہ کیا اسی طرح اب کبوتر کی مثال دیکر اس کی سبک پری اور دانہ چنیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، "بیضۂ زر" سے روشنی مراد ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کبوتر کی طرح ایک برج سے دوسرے برج میں اُڑتا ہوا پہونچتا ہے، اور ان میں سونے کے انڈے دیتا جاتا ہے۔

ازہمہ کشتہ فلک دانہ خوشۂ خور دوبس چوں سوئے برج خوشہ رفت از سر برج آذری

آسمان بمنزلہ ایک کشت زار ہے، اور آفتاب مثل کبوتر ہے، اب ایک طایر کے لئے خوشہ چینی کرنا ضروری ہے اس لئے برج سنبلہ موجود ہے، برج آذری "برج اسد" کو کہتے ہیں ابیات بالا میں شاعر نے آفتاب کے داخلۂ اسد کا حال لکھا تھا "برج اسد" کے بعد چونکہ برج سنبلہ ہے اس لئے اب اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

از سر خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو کرد رگ گلوش را از سر داس نشتری

یعنی "برج سنبلہ" (خوشہ) میں یکایک آفتاب کے حلق میں داس گڑ گیا اور اس وجہ سے اس کی گردن مجروح ہو گئی، "داس" اس باریک خس کو کہتے ہیں جو ہر دانہ کے سرے پر ہوتا ہے برج سنبلہ میں چونکہ آفتاب کو وبال ہوتا ہے اسی لئے اس کی جراحت کا تذکرہ کیا۔

گوئی ازاں رگ گلو ریختہ اند در رزاں اینہمہ خوں کہ می کشند آتشی و معصفری

اب فرماتے ہیں کہ رگ گردن کا یہی خون انگور میں پیوست ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے شراب سرخ و زرد تیار ہوتی ہے۔

نظرات سیارگان

خاقانی زندان میں ہیں ہاتھوں میں ہتکڑیاں، پیر میں بیڑیاں ہیں دل رنجور اور جسم سوگوار بنا ہوا ہے، اسی عالم میں شاعر نے ایک نہایت معرکۃ الآرا مرثیہ لکھا یا یوں کہئے نظم میں دربار شاہی میں اپیل کی اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ ابیات بھی لکھے ہیں۔

بہ تثلیث بر درج و ماہ و انجم بہ تربیع و بہ تثلیث و ثلاثا

کہ بہر دیدن بیت المقدس مرا فرماں بخواہ از شاہ دنیا

"تثلیث" "تربیع" "تسدیس" اور "مقابلہ" نجومی اصطلاحیں ہیں یعنی دو سیاروں کے درمیان

ایکسو بیس درجہ کا تفاوت ہو تو اس کو "نظر تثلیث" کہتے ہیں مثلاً ایک سیارہ برج حمل میں ہو اور دوسرا برج اسد میں۔ اگر ایکسو اسی درجہ کا تفاوت ہو تو "مقابلہ" کہیں گے، اگر ساٹھ درجہ کا فرق ہو تو "تسدیس" اور نوسے درجہ کا فرق ہو تو "تربیع" کہتے ہیں مثلاً آفتاب برج حمل میں اور ماہتاب برج سرطان میں بہ تفاوت نوے درجہ ہو تثلیث وتسدیس کو سعد اور تربیع ومقابلہ کو نحس کہتے ہیں۔

شعر کے معنی ہیں کہ ماہ وانجم کے نظرات تثلیث وتربیع کی قسم بادشاہ سے میرے لئے بیت المقدس جانیکی اجازت حاصل کیجئے، خاقانی نے اس مرثیہ میں وزیر عز الدولہ کو مخاطب کیا ہے اور اسی وزیر سے فرمان شاہی حاصل کرنے کی التجا کی ہے۔

سعد ذابح خاقانی نے ایک قصیدہ میں دشت موقف، ہشتم ذی الحجہ، مسجد خیف، جمرہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور فریضہ حج اور حجاج کے متعلق نہایت ہی لطیف اشعار لکھے ہیں اسی سلسلہ میں قربانی کے مسئلہ پر فرماتے ہیں۔

سعد ذابح بہر قربان تیغ مریخ آختہ　　جرم کیوانش چوں سنگ ملی افسان دیدہ اند

"سعد ذابح" برج دلو میں ایک ستارہ ہے اور دلو "زحل" کا گھر ہے مریخ کو ترک فلک کہتے ہیں جو تیغ وخنجر کی طرف منسوب ہے، "زحل" کو پتھر کی طرف نسبت دیتے ہیں چونکہ اس سیارہ کا جسم سخت و درشت ہے "افسان" ایک قسم کا سیاہ سبز رنگ کا پتھر ہوتا ہے جس پر چاقو اور خنجر وغیرہ تیز کرتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ سعد ذابح نے مریخ کی تلوار لی اور زحل کے جسم پر جو بمنزلہ "افسان" ہے اسکو تیز کیا اور فریضہ قربانی ادا کیا خاقانی نے حجاج کے فریضہ قربانی کے لئے ایک بے مثل منجمانہ تشبیہ دی ہے۔

دمدار ستارہ جلال الدین شروان شاہ کی مدح میں خاقانی نے "گنج رواں افشاندہ اند" آسمان افشاندہ اند کے قوافی ورد یف میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اس نے بہت سے منجمانہ اشارات کئے ہیں فرماتے ہیں۔

تا غبار از چتر شاہ اختران افشاندہ اند　　فرش سلطانیش در برتر مکان افشاندہ اند

شحنہ بنور وز نعل نقرہ خنگش ساختست　　ہر زرے کاکیر سازان خزاں افشاندہ اند

رستہ چوں یوسف زچاہ دلو پیش ابر صبح　　گوہر از الماس ومشک از پرنیان افشاندہ اند

درر کابش ہفت گیسو دار وشش خاتون زدیف　　بر سرش ہر ہفت وشش عقد جان افشاندہ اند

بست ویکسا پیکر از مقلاب دار دخیلتاش　　گرد راہ خیل او تا قیرواں افشاندہ اند

خاقانی نے ان ابیات میں آفتاب کے خروج دلو، اور داخلہ برج حمل کا تذکرہ کیا ہے اور ان سے جو

اثرات موسمی مترتب ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی سلسلہ میں جلال الدین شروان شاہ کے جلو میں غلاموں اور کنیزوں کو دیکھ کر ایک نہایت ہی پر لطف تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ بادشاہ کے رکاب میں جو غلام اور لونڈیاں ہیں وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد دمدار ستارے اور سیارے عقد ثریا نچھاور کر رہے ہیں اور بادشاہ کا جلال یہیں تک منحصر نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح فلک ہشتم میں کل ثوابت مرکوز ہیں اور چھتیس صورتیں ہیں اور ان میں ۲۱ صورتیں شمال کی طرف اور پندرہ صورتیں جنوب کی طرف ہیں اسی طرح جلال الدین شروان شاہ کے خدم وحشم نے سقلاب (جو شمال میں ہے) سے قیروان تک غبار بلند کر رکھا ہے مرقومۂ بالا ابیات میں ہر شعر تشریح طلب ہے لیکن ان صفحات میں اس کی گنجایش نہیں پھر بھی ایک شعر کی کسی قدر وضاحت کر دینا ضروری ہے فرماتے ہیں۔

در رکابش ہفت گیسو دار و شش خاتون ردیف   برسرش ہر ہفت و شش عقد جمان افشاندہ اند

"ہفت گیسودار" سے دمدار ستارے مراد ہیں جو "میل مرکزی" (آفتاب کی کشش) کی قوت سے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں اسمیں شک نہیں خاقانی کے زمانہ میں بھی ان ستاروں کو "مایہ بخار دخانی" سمجھا جاتا تھا جو ایتھر کے تصادم سے مشتعل ہو جاتے ہیں قدیم ہیئت دانوں نے نظام شمسی کے سلسلہ میں ستارۂ دمدار کا تذکرہ نہیں کیا وہ سبعہ سیارہ کے قایل تھے، لیکن اب علم ہیئت کا یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کثرت سے دمدار ستارے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں، ہاں ان میں بعض کی گردش معینہ ہے اور بعض کی غیر معینہ، دو سو دمدار ستاروں کا دائرۂ گردش دریافت ہو چکا ہے، ان میں چالیس ستارے، جو ہمارے نظام شمسی میں داخل ہو چکے ہیں ایک زمانہ معینہ میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کرتے ہیں اور اکسو ساٹھ سیاروں کا مرکز بدلتا رہتا ہے تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان دمدار ستاروں کا مدار بالکل بیضاوی ہے اور ان کا جسم مثل کہر کے بخارات نیم منجمد کا ہوتا ہے ان دمدار ستاروں میں کئی کے سر پر ایک روشن تارہ نظر آیا ہے جس کی ضیا پاشیوں سے خطوط شعاع پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طاؤس آسمان پر مستانہ رقص کر رہا ہے، خاقانی نے ان دمدار ستاروں کی تعداد سات ہی بتائی ہے، لیکن دو ہزار سال کے درمیان چھ سو دمدار ستارے نظر آئے، بہر حال عربی میں ان ستاروں کو "ذوات الاذناب" اور یورپی اصطلاح میں "کومٹ" (Comet) کہا جاتا ہے "شش خاتون ردیف" سے آفتاب کے علاوہ چھ سیارے مراد ہیں "عقد جمان" موتی کے ہار کو کہتے ہیں لیکن یہاں کنایۃً نجم "ثریا" سے ہے جو چھ ستارے برج ثور میں یکجا ہیں تو خاقانی کے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب جب برج حوت سے برج حمل میں آیا تو دمدار تاروں اور چھ سیاروں نے عقد ثریا کو "شاہ اختران" یعنی آفتاب پر نچھاور کیا۔

عبدالمالک آروی

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

ایکٹ ۴ ۔ سنہ ۱۸۵۸ء

منظر اول

(بالاخانہ کے نیچے جھانسی راج کے محل کا صحن، وقت شام، تاریخ ۳ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء۔ لوگوں کا ہجوم رانی اور اُس کی فوج کا خیر مقدم جبکہ رانی، راجہ اور چھا اور اُس کے رفقا سے جنگ کرکے واپس آنے والی ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے۔ سانپ کا تماشہ، مداری کا تماشہ اور بانس کی ورزش کا تماشہ شروع ہوتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد دیوان تارا سنگھ دروازہ سے گزر کر صحن میں پہونچتا ہے اور ایک گھوڑے پر جو اُس کے سامنے فوراً لایا جاتا ہے سوار ہوتا ہے۔ "دیوان صاحب کی جے" کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اور وہ متانت سے مسکرا کر سلام لیتا ہے، لوگ اُس کے گھوڑے کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اُن سے مخاطب ہوتا ہے)۔

تارا سنگھ:۔ بھائیو! چند منٹ میں ہمارا پیارا حکمراں ہمارے پاس آجائے گا۔ راج کے دشمنوں سے کئی مہینے کے سخت مقابلہ کے بعد واپس ہوگا۔ جھانسی راج کی نئی زندگی کے بعد سے نو مہینے تک جیسا آپ سب جانتے ہیں رانی لکشمی بائی راجدھانی کا انتظام کر رہی ہیں، یہ رانی ہی کی ذات ہے کہ راج کو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم وہ استحکام حاصل ہے جو راجہ گنگا دھر کے زمانہ میں تھا۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم رانی کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی اور دلی محبت کے ساتھ کریں۔ اور اپنے سپاہیوں کی شاندار فتح کی جو اُنھوں نے نتھے خاں، اور مہاراجہ اورچھا کی فوجوں پر حاصل کی ہے خوشی منائیں۔ (دیوان صاحب کی جے کے نعرے) میں اب اپنے معزز حکمران کے خیر مقدم کے لئے شہر

باہر جاتا ہوں اور اُس کو یہاں لاتا ہوں - آپ کا رانی کو خیر مقدم کہنا، رانی کی اُن شجاعانہ کارگزاریوں کا تسلیم کرنا ہے جو اُنھوں نے اور اُن کے معزز باپ نے باشندگان جھانسی کے لئے انجام دی ہیں -

(رانا صاحب روانہ ہوتے ہیں اور "دیوان صاحب کی جے" کے نعرے جاری رہتے ہیں -

ایک بگل کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھکر ایک سریلے راگ میں تبدیل ہو جاتی ہے - جس میں ہندوستانی ڈھول جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں شامل ہیں اور وقتاً فوقتاً ناقوس کی بھی آواز آتی ہے - باجا وحشیانہ اور بے قاعدہ تھا - جب قریب آیا تو مردانی آوازیں جو ایک ساتھ پیدا ہو رہی تھیں کان میں آئیں اور فوراً مسلح آدمی چہار جانب سے صحن میں آ گئے - اُن کے آگے باجے والے - بگل والے اور ناقوس بجانے والے تھے - اکثر فوجی افغان اور روہیلہ تھے جو صاحب ریش تھے یا مغربی ہند کے مرہٹے تھے اور مختلف اقسام کے اسلحہ اور بندوق، رائفل تیر کمان بھالے تلوار اور برچھے وغیرہ مختلف اسلحہ سے آراستہ تھے، وردیاں بنگال کی فوجی سپاہیوں کی سی تھیں اور کچھ دوسری قسم کی ابتدائی وحشی اقوام والی خکاری پوشاکیں بھی تھیں - ڈھال زرہ بکتر بھی تھے - فوج صحن میں داخل ہوتے ہوئے چند اشعار گا رہی تھی اور اسلحہ کی جھنکار یا تالی بجا کر تال ملایا جاتا تھا -

سرخ علم بلندی پر نصب کیا گیا جس کو ہر شخص نے دیکھا اور رانی لکشمی بائی کی حکومت سے خوش ہو کر "رانی کی جے، کمار کی جے" کے نعرے لگائے -

لوگ راگ کا آخری حصہ فوج کے ساتھ غل مچا کر دہرانے لگے، شور وغل بڑھتا گیا - اور جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو رانی اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہوئی، آگے سرخ علم تھا جو کسی وقت علحدہ نہ ہوتا تھا - مرہٹہ گارڈ کے افسر کی وردی رانی نے زیب تن کی تھی جس میں چست کرتہ، سفید پائجامہ اور پگڑی تھی اور پٹکے سے تلوار لٹک رہی تھی - اور پگڑی میں ایک نیلے رنگ کا طرہ بھی تھا - اُس کے پاس ہاتھی پر انند راؤ بھی ہے اور وہ بھی ایسے ہی لباس سے مزین ہے - تارا سنگھ، راما صاحب راؤ آپا اور گنگا بائی رانی کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر ہیں - گنگا بائی رانی کی سی پوشاک پہنے ہے لیکن طرہ نہیں ہے - رانی اور انند راؤ ہاتھی پر بیٹھے ہیں، مجمع کے لوگ سلام کر کے ارد گرد آ جاتے ہیں - فوجیں اسی اثنا میں باجہ بجاتی ہوئی اپنے اپنے مقام پر کھڑی ہو جاتی ہے، راما صاحب اُتر کر محل میں داخل ہوتے ہیں - تارا سنگھ راؤ آپا اور گنگا بائی بھی اُترتے ہیں لیکن وہ ہاتھی کے قریب کھڑے رہتے ہیں - رانی چاروں طرف سلام لیکر تقریر کی خواہش کرتی ہے -

(مجمع خاموش ہو جاتا ہے اور عماری سے جہاں انند راؤ بھی بیٹھا ہے تقریر شروع کرتی ہے۔)

رانی :- پیارے دوستو! بھائیو! بہنو! آپ نے جو میری واپسی پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے اس سے میرے قلب پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ہم کو بھی واپسی پر بہت غیر معمولی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ہم کو گزشتہ مہینوں میں سخت صعوبت اُٹھانی پڑی کیونکہ ہم نے گستاخ دشمنوں پر جو ہماری پاک زمین پر حملہ کر رہے تھے فتح پائی۔ مجھے فخر سے کہنے کا موقع حاصل ہے کہ شیوجی اور مہادیوجی کی مہربانی سے ہمارے بہادر سپاہیوں نے نتھے خاں اور راجہ اورچھا کی فوجوں کو ہر طرف سے پسپا کر دیا۔ (اس پر نعرے رانی لکشمی بائی کی جے کے بلند ہوتے ہیں اور رانی ہاتھ اُٹھا کر پھر سب کو خاموش کرتی ہے) لیکن بھائیو! میں آپ کو تنبیہ کرتی ہوں کہ ہماری مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ ابھی ہم کو جلد ایک دوسرے دشمن کا جو مہاراجہ اورچھا اور نتھے خاں سے زیادہ سخت ہے مقابلہ کرنا ہے۔ یہ خبر ہم کو راستے میں موصول ہوئی ہے کہ انگریزوں نے ساگر میں ایک بڑی فوج جمع کی ہے اور ہمارے مقابلہ کے لئے وہ روانہ ہو چکے ہیں۔ (مجمع کے لوگوں پر سنجیدگی چھا جاتی ہے) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم راستی پر ہیں اور ہمارے ذرائع بھی کافی وسیع ہیں۔ ہمارے شہر جھانسی میں صرف غلہ ہی کا ذخیرہ کافی نہیں ہے بلکہ جملہ سامان جنگ بھی موجود ہے اور تانتیا ٹوپی اور رنپور کے راجہ نے بھی ہم کو آدمی اسلحہ اور توپیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جب انگریز حملہ کریں گے تو ان کی مدد ہم کو ملجائیگی (نعرے جھانسی راج کی جے) کے لگتے ہیں۔ پس اگر دشمن ہمارے گھر کے قریب بھی آجائے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے سپاہیوں کے پیچھے کھڑے رہیں تو آپ نتیجہ سے واقف ہو جائیں گے۔

(فوج پھر نقل و حرکت کا راگ بجانے لگتی ہے۔ رانی اور انند راؤ ہاتھی سے اُتارے جاتے ہیں اور ہاتھی الگ لیجایا جاتا ہے۔ رانی مجمع کے بیچ میں مع انند راؤ کے گزرتی ہے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جو لوگ قریب ہیں اُن سے مخاطب ہوتی ہے۔)

رانی :- اب بھائیو! معاف کرنا چونکہ مجھے مہادیوجی کے مندر جانا ہے اس لئے منھ ہاتھ دھونے کے لئے اندر جاتی ہوں۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور میلی ہو رہی ہوں۔ میں نے ماما صاحب اپنے والد بزرگوار سے دریافت کر لیا ہے۔ اُن کی عاقلانہ حکمت کے باعث فتح نصیب ہوئی ہے۔ اس وقت میں جو کچھ کہہ سکتی ہوں یہ ہے کہ تم کو ہماری مہمات اور ہماری فوج کی شجاعت کا علم ہو جائے۔ آج شام کو میں رہنمایان شہر کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کروں گی تاکہ انگریزوں کے خلاف تحفظ کا سامان بہم پہنچ سکے اور آپ کو بتاؤں گی کہ جنگ کے لئے میں آپ سے کیا چاہتی ہوں جو آپ میں ہندو ہیں مندر ہو آئیں اور وہاں نذر چڑھائیں اور فتح کے لئے جو ہم کو حاصل ہوئی ہے شکریہ ادا کریں اور اس آئندہ کی جنگ میں فتحیابی کی دعا مانگیں۔ اور مسلمان میرے لئے اپنے اللہ سے مدد مانگیں۔ سلام۔ مستقبل سے نڈر و نڈل میں شک نہ لاؤ۔ نتیجہ اچھا برآمد ہوگا۔ لیکن اپنا وقت غفلت اور آرام طلبی میں نہ گنوانا۔ ہمارے سامنے ایک

بڑا کام ہے۔ اور ہم کو اُس کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

(جونہی وہ تقریر ختم کرتی ہے "رانی صاحبہ کی جے" "کمار صاحب کی جے" کے نعرے بلند ہوتے ہیں تمام سپاہی اپنا باجہ بجانے لگتے ہیں اور اُن کے اسلحہ سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ اسی اثنار میں رانی ہاتھ جوڑ کر چاروں طرف گھومتی ہے اور پھر محل میں داخل ہوتی ہے اور اُس کے آگے سرخ علم اور انند راؤ چلتا ہے اور پھر تارا سنگھ گنگا بائی اور راؤ آبا چلتے ہیں۔ ماما صاحب بالاخانہ پر آتا ہے اور مجمع "ماما صاحب کی جے" کا غل شروع کرتا ہے۔ اور ماما صاحب سلام کرتا ہے۔ پردہ اُس غل مچانے والے مجمع پر گرتا ہے اور وہ سب مجتمع ہو کر بالاخانہ کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں کہ ماما صاحب کی تقریر سنیں)۔

منظر دوم

(دربار کا کمرہ۔ تاریخ ۲ اپریل، وقت آدھی رات، انگریزوں نے سر ہیوگ روز کی ماتحتی میں جو بعد میں لارڈ اسٹراتنارن کے نام سے مشہور ہوا جھانسی کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ گدی دکھائی دیتی ہے۔ کمرہ غیر آراستہ ہے اور ہر چہار طرف بندوقیں تلواریں اور اسلحہ پھیلے ہوئے ہیں۔ باہر سے رائفل کے فیر کی آواز آتی ہے لیکن توپ کی کوئی آواز نہیں ہے۔ رانی اپنی پوشاک پہنے ہوئے گدی پر رونق افروز ہے اور انند راؤ اُس کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ آخری مرتبہ ذی اقتدار ہستیوں سے مشورہ کر رہی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں ہیں اور گو کہ وہ خاموش ہے تاہم اس کے چہرہ سے اندرونی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ اُس کے سامنے اکابر کا مجمع ہے جن میں سے اکثر ہندو ہیں اور سب سنجیدہ ہیں اور گردن جھکا کر تارا سنگھ کی تقریر سن رہے ہیں۔ رانا سنگھ ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا مجمع سے مخاطب ہو رہا ہے۔ ماما صاحب بھی بیٹھا ہوا مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔ اور دیوان بھی بیٹھا ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی (وردی میں) گدی کی بائیں جانب بیٹھے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے بالاخانہ پر جاتے ہیں اور حملہ کی علامات دیکھتے ہیں۔

تارا سنگھ:۔ (سسکیاں روک کر) بھائیو اور دوستو! وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہم کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب تک تانتیا صاحب کی امداد کی اُمید تھی ہم کو انگریزوں کے مقابلہ کا زیادہ خوف نہ تھا۔ ہمارے لئے انگریزوں سے مقابلہ آسان تھا۔ لیکن اب کہ تانتیا کی فوج ہماری آنکھوں کے سامنے شکست کھا چکی ہے اور وہ خود بتیوا سے کالپی کی طرف بھاگ چکا ہے تو ہماری شکست بھی یقینی ہے، ہمارا دوسرا حامی رنپور کا راجہ بھی شکست کھا چکا ہے۔

ایک سردار:- سچ ہے دیوتاؤں کا دلی منشا سمجھنا بہت مشکل ہے، یہ کون سمجھ سکتا تھا کہ تانتیا صاحب کی قوی فوج کو کمپنی کے چند سپاہی دھوئیں کی طرح اُڑا دیں گے۔

ماماصاحب:- (پریشان ہوکر اور جھٹک کر) یہ کمبخت توپیں اور فوج کی قواعد دانی سب کام خراب کر دیتی ہے۔ یہ توپیں جو ہمارے قلعہ کی دیواروں کو ڈھا دیتی ہیں ہر چیز تباہ کر سکتی ہیں۔ ہمارے بہادر افغانی سپاہی بھی جبکہ توپوں کو دیکھکر کانپنے لگتے ہیں۔ ہمارے قلعہ کی دیوار میں اُنھوں نے گاڑی بھر کا راستہ بنا بھی لیا ہے۔ اور ہم مرمت کی جو کوشش کرتے ہیں بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ہم بوقت تمام پتھر لگا کر اُس کی مرمت کرتے ہیں اور وہ اُس کو توپوں سے چکنا چور کر ڈالتے ہیں۔

راؤ آبا:- (خاموشی سے) ہماری توپ کی جگہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی جگہ توپ رکھتے ہیں تو وہ اسکو برباد کرنے کی فکر کرتے ہیں اور کسی نہ کسی وقت برباد کر دیتے ہیں۔ اکثر ہمارے آدمی بھی جن کے پاس اچھے ہتھیار نہیں ہیں ضایع ہوتے ہیں۔ میدان جنگ کے لئے کوئی بھاری توپ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ محل ہمارے پاس محفوظ جگہ پر نہ ہوتا تو کب کا اُڑا دیا جاتا۔

ماماصاحب:- (کمزور آواز سے) میں صرف اُن کی توپوں ہی کی تعریف نہ کروں گا۔ اصل چیز اُن کا قاعدہ قانون ہے۔ جب انگریز حاکم کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یا تو کام پورا ہوگا یا سپاہی اپنی جان ضایع کر دیں گے۔ ہمارے آدمی بھی انگریز سپاہیوں کی طرح بہادر ہیں لیکن تعمیل حکم نہیں کرتے۔ اگر میں کسی کام کا حکم دوں تو اُس کو پورا کرانے کے لئے مجھے کھڑا رہنا پڑے گا۔ ورنہ حکم بیکار ہو جائے گا۔ ہم فرداً فرداً جنگ کرتے ہیں وہ متحدہ کوشش کرتے ہیں۔ یہی اصل فرق ہے۔ اچھی توپیں اور مستعدانہ قواعد کی پابندی۔

رانی:- (تھکی آواز میں) کیا مناسب نہ ہوگا کہ ہم اُسوقت پر غور کریں جب انگریز یہاں گھس آویں گے۔ ہم کو اُسوقت کیا کرنا چاہئیے۔ ہماری قسمت پر مہر لگی ہوئی ہے بس ہم کو اُن واقعات کی بات چیت کرنی چاہئے جو تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے آنے والے ہیں۔

ایک سردار:- رانی صاحبہ! آہ! مستقبل کا کیا سوچنا۔ ہمارے دل خود اپنی بدقسمتی پر رو رہے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ انگریز بڑے بڑے لوگوں کو توپ سے اُڑا دیتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں چاروں طرف پھینکدیتے ہیں۔ پھر ہم اپنے لئے کیا سوچیں جبکہ ہم کو ڈر ہے کہ رانی لکشمی بائی کے لئے یہی مصیبت آنے والی ہے۔

(دوسرے سردار اس تقریر کی موافقت میں سر ہلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہے! ہے! لکشمی بائی! بیچاری رانی لکشمی بائی)

رانی:- (غمزدہ ہوکر مسکراتی ہوئی اور چاروں طرف سلام کرتی ہوئی) دوستو! مت ڈرو! لکشمی بائی انگریزوں کو

اُن کی ہیبت توپوں کے لئے بارود مہیا کردے گی۔ (اپنی کمر سے ایک خنجر نکالکر اور دکھاکر) اگر میرا مردہ جسم اُن کو اطمینان بخش سکتا ہے تو آئیں۔ لیکن مجھے وہ زندہ نہیں لے جاسکتے۔ (افسوس کے ساتھ سب نے تائید کی) لیکن ہم ضرورت سے زیادہ پیشین گوئی کررہے ہیں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ والد صاحب!

ماما صاحب :- جنگ کرنے والے سپاہی اپنی زندگی بیچنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم انگریزوں کے ہاتھوں میں پہونچکر اُن سے کوئی رحم کی اُمید نہیں کرسکتے۔ پس بجائے اطاعت قبول کرنے کے ہم لڑتے لڑتے مرجانا پسند کرینگے

تیسرا سردار :- آبادی کے بھاگنے کا راستہ ہر طرف سے مسدود ہوچکا ہے۔ آج شام کو جب تانتیا صاحب کی شکست کی خبر ملی میرے چند احباب معہ اپنے بال بچوں کے شمالی پھاٹک سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لیکن انگریزی فوج فوراً اس کو سمجھ گئی۔ اور جو نہیں مارے گئے تھے وہ قصبہ میں مضطرب ہوکر داخل ہوگئے۔ اب جو قسمت دکھائیگی دیکھنا پڑے گا۔

رانی :- والد صاحب! آپ کے خیال میں انگریز کتنی دیر میں حملہ کریں گے۔

ماما صاحب :- اب جسوقت چاہیں حملہ کرسکتے ہیں کیونکہ دیوار میں شگاف ہوچکا ہے۔ جنرل روز اگر سویرے حملہ کردے تو مجھے تعجب نہ ہوگا کیونکہ فوج نے تانتیا کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کا افسر بہت جوشیلا ہے اور ہمیشہ حملہ ابتدا ہی میں کرتا ہے۔

رانی :- (کھڑے ہوکر اور فیصلہ کن لہجہ میں) پس ہم کو اپنی ترکیب فوراً سوچ لینا چاہئے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ شرفا کی آبادی اور اُن کے بال بچوں کو کسی طرح اذیت نہ پہونچنے پائے۔ بہت سی عورتوں کی زندگی دیوار کی مرمت میں ضائع ہوئی۔ پس جنوب میں جتنے مکانات ہیں اور جس طرف شگاف ہے سب خالی کردئے جائیں جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہیں وہ شمالی حصہ میں جمع ہوجاویں۔ اُسی طرف دیوان صاحب رہیں گے اور جب انگریز اُدھر آویں گے تو وہ شکست تسلیم کریں گے۔ ہمارے لڑنے والے سپاہی جنوب میں رہیں گے اور ہر مکان کے مکین کو پورا مقابلہ کرکے جان دیدینا چاہئے۔ اور محل آخری دم تک نہ چھوڑنا چاہئے۔ جب انگریز شہر میں جنگ وجدل کریں اُسوقت ہم آسانی سے قلعہ چھوڑ سکتے ہیں اور محافظ سپاہی اور سوار بھی قلعہ سے علٰحدہ ہوسکتے ہیں اُن کا یہ فرض ضرور ہے کہ کمار انند کو دشمنوں کے ہاتھ میں جانے سے بچائیں۔

جب تک کمار آزاد ہے جھانسی راج کے دوبارہ قایم کئے جانے کی اُمید باقی ہے۔ تانتیا نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ اگر جھانسی ہاتھ سے نکل جائے تو میں کمار انند اور جتنے آدمی ہوسکیں اُن کو لیکر فوراً اُس سے کالپی میں لوں

ہمت نہ ہارو! دوستو! سیواجی مغلوں سے اپنی زندگی بچاکر لیگیا اور آخر میں اُن پر غالب آیا۔ جھانسی انگریزوں کے ہاتھ میں چلی جائے لیکن اگر ہم اپنے اعتقاد کو مضبوط رکھیں اور ہوشیاری سے کام لیں تو جھانسی پر پھر

ہماری حکومت ہو جائے گی۔

(رانی تھوڑی دیر تک اُن کی طرف دیکھتی ہے اور گدی سے اُتر کر آتی ہے اور ہر ایک کو کھڑا کر کے اُس کو ہندو طریقہ سے سلام کرتی ہے۔ ہر ایک رانی کے سلام کا جواب دیتا ہے اور جھک کر اُس کا پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ سر تک اُٹھاتا ہے۔ جب تمام اکابر رخصت ہو جاتے ہیں تو رانی واپس ہوتی ہے، اور ایک مرتبہ گھوم کر پھر سلام کرتی ہے۔ اکابر جو کمرہ میں ہیں رونا شروع کرتے ہیں اور کچھ کی سسکیاں بندھ جاتی ہیں۔ ان اکابر کے جانے کے بعد جو رہجاتے ہیں ماما صاحب ہے جو بے صبری سے رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور سسکیاں لیتے ہوئے پیروں پر گر پڑتا ہے)۔

ماما صاحب:۔ (سسکیاں لیکر) بیٹی مجھے اس مصیبت کے لئے جو میری ذات سے تیرے سر پر آئی ہے معاف کر۔ اگر میری موت سے تیری مصیبت میں کوئی کمی ہو جائے تو میں اسی وقت مرنے کے لئے تیار ہوں۔

رانی:۔ (اپنے والد کو اُٹھاکر اور سپاہی کی طرح اُس سے چمٹ کر) والد صاحب! آپ کو اب کسی بات سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ آپ نے گزشتہ چند مہینوں میں جھانسی کی خدمت کی ہے وہی ماضی کے واقعات بھلادینے کے لئے کافی ہے۔ آپ نے مجھے ایک معزز مرہٹہ عورت بننے کا سبق دیا ہے اور جب تک میرے جسم میں جان ہے میں آپ کی نصیحت کی عزت کروں گی۔ قسمت نے ہم کو آپ سے جدا ہونے کا سامان کر دیا ہے۔ آپ جب تک ہو سکے انگریزوں کا مقابلہ کیجئے اور میں انند کمار کو لیکر بھاگوں گی تاکہ پھر جنگ جاری کیجا سکے۔ دیوتاؤں اور دیویوں سے دعا کرتی ہوں کہ وہ لڑنے والوں کو طاقت عطا کریں جس کی کامیابی کیلئے ضرورت ہے۔

(ماما صاحب آستین باندھ کر تعظیم کرتا ہے اور سیدھے ہاتھ سے رانی کے پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے)

ماما صاحب:۔ (سر جھکاکر) بیٹی! میں منکسرانہ طور پر کہتا ہوں کہ میں تم سی بیٹی کا باپ ہو کر بہت فخر کر سکتا ہوں۔ میں اب مر سکتا ہوں مگر مرتے دم تک مجھے اس بات کا پورا یقین رہیگا کہ خواہ تمہارا اور انند کا مستقبل کچھ ہی کیوں نہو لیکن رانی لکشمی بائی میری عزیز بیٹی کا قصہ مرہٹہ قوم کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہیگا بلکہ ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی زبان پر رہیگا۔

(جھکتا ہے، سلام کرتا ہے اور کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد تارا سنگھ سامنے آتا ہے اور جھک کر رانی کے پیر سیدھے ہاتھ سے چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے اور پھر کھڑا ہو کر تقریر کرتا ہے)

تارا سنگھ :- (سسکیاں چھپاکر) رانی صاحبہ! میں آپ کا مطیع اور غلام ہوں۔ میری التجا ہے کہ جو کام آپ نے میرے سپرد کیا ہے کسی دوسرے کے سپرد کر دیجئے۔ میں ماما صاحب اور فوج کے ساتھ اپنی موت کو پسند کرتا ہوں۔

رانی :- (دبدبہ سے) دیوان صاحب! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ تم مجھ سے پوری طور پر واقف نہیں ہو۔ میں ایک باعزت موت کا موقع کھو رہی ہوں جو کہ مجھے اپنی فوج کے ساتھ جنگ کرنے میں حاصل ہے۔ میرا صرف خیال یہ ہے کہ شاید ہم کو تانتیا صاحب کی مدد مل جائے اور ہم دوبارہ لڑ کر فتحیاب ہو سکیں جو کچھ میں کر رہی ہوں مجھے پسند نہیں ہے، لیکن ایسا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تم کو بھی میرے حکم کی تعمیل کرنا چاہئے ورنہ پھر تم لکشمی بائی کے نوکر نہیں ہو۔

تارا سنگھ :- (جھک کر اور سلام کر کے) شاہزادی! معاف کرو۔ میں نے سخت بیوقوفی کی۔ میں اپنے کام سے خود واقف نہیں۔ اگر انگریز مجھے زندہ رہنے دیں گے تو میرے دل میں ہمیشہ یہی ہوس رہیگی کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ سرخ جھنڈا لہرائے اور لوگ رانی کی جے کے نعرے لگائیں۔ (یہ کہکر باہر جاتا ہے)

(تارا سنگھ جب اپنی تقریر ختم کرتا ہے توپ کے گولے کی آواز آتی ہے۔ اس آواز کے بعد پھر آواز آتی ہے۔ توپیں چلنے لگتی ہیں اور بیچ بیچ میں بندوق کی آواز آتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑتی ہے اور راؤ آپا انند راؤ کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ تارا سنگھ تب دربار چھوڑتا ہے اور رانی بالاخانہ کی سمت روانہ ہوتی ہے جہاں ایک سرخ جھلک دکھیتی ہے)

رانی :- (بالاخانہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) یہ انگریز ہی ہوں گے۔ انھوں نے پھرتی کی مگر لکشمی بائی کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ عزیز و جلدی کرو۔ چلو قلعہ میں اور وہاں سے گھوڑوں پر کالپی روانہ ہو جائیں۔ ہم کو دیواریں پھاندنا پڑے گا اور راستہ کاٹ کر بنانا ہوگا۔ لیکن حملہ کی گھبراہٹ میں ہم کو بھاگ جانے کا کافی موقعہ مل جائے گا جلدی کرو ایک لمحہ ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے۔

(گنگا بائی جو کمرہ میں واپس آئی ہے اور راؤ آپا مکر گٹھری اٹھاتے ہیں۔ وہ انند راؤ کو لیکر کمرہ سے بھاگتے ہیں۔ رانی پیچھے روانہ ہوتی ہے اور دروازہ پر ٹھہر کر گھومتی ہے اور حسرت کی نگاہ کمرہ پر ڈالتی ہے گویا کہ اُس کا نقشہ صفحہ دماغ پر لے لینا چاہتی ہے۔ بالآخر سیدھی ہو کر ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی ہے اور ایک سسکی لیتی ہے)

منظر سوم

(کوٹہ کی سرائے کا ایک باغ۔ شہر گوالیار کے قریب ایک جا۔ وقت غروب آفتاب تاریخ ۱۷ جون ۱۸۵۸ء)

برٹش افواج کا تانتیا ٹوپی اور رانی جھانسی سے جو دونوں تھوڑے عرصہ کے لئے گوالیار کے مالک بنگئے ہیں مقابلہ۔ مہاراجہ سندھیا نے اُس موقع پر اپنی سلطنت سے دست برداری کرلی ہے۔ رانی اپنی وردی میں ہے اور اُس کے بائیں ہاتھ میں گولی نے ایک سخت زخم کردیا ہے اور سر پر بھی تلوار کا زخم لگا ہے۔ اُس کو باغ میں مرنے کے لئے لے گئے ہیں۔ اُس کے وفادار رفقا گنگا بائی اور راؤ آبا تیمارداری کر رہے ہیں۔ گنگا بائی بھی مردانہ وردی میں ہے اور سخت غمزدہ ہے۔ اُس کی گود میں رانی کا سر ہے۔ اُس کے زخم کو دھو رہی ہے اور تر کر رہی ہے۔ پانی باغبان نے ایک مٹی کے برتن میں لاکر دیا ہے۔ راؤ آبا ایک جانب کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ اُس کا بھی جنگ میں ایک بازو کٹ گیا ہے اور بہت ہی مضطرب اور پژمردہ ہوگیا ہے۔ رانی کو ایک گدے پر لٹا دیا گیا ہے اور وہ بیہوش ہے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ حرکت کرتی ہے اور کسی قدر ہوش میں آتی ہے اور غیر مسلسل تقریر کرتی ہے)

رانی:۔ (آنکھ بند رکھ کر) تانتیا صاحب کیوں حملہ نہیں کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ انگریزوں کو ابتدا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ہم کو خود حملہ کرنا چاہئے۔ (ٹھہر جاتی ہے) انند! (پھر زور سے کہتی ہے) انند! (پھر ٹھہر کر اور زور سے کہتی ہے) انند!

(رانی بیٹھ جاتی ہے اور چاروں طرف دیکھتی ہے۔ پھر تکلیف سے بیتاب ہوکر بائیں جانب ہاتھ رکھ کر آہستہ سے آہ بھرتی ہوئی گدے پر گر پڑتی ہے۔ گنگا بائی اُس کا سر نرمی سے ہاتھ پر لے لیتی ہے)

رانی:۔ (کراہ کر) گنگا بائی! ہم کھو گئے!۔ کھو گئے! شیوجی نے ہم کو چھوڑ دیا۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے تھے۔ ہم جب لڑتے ہیں پیچھے ہٹا دئے جاتے ہیں۔ میرا باپ جا چکا ہے۔ انند بھی گیا۔ میں بھی اب جاتی ہوں۔ اُن کی طاقت کا بھید بڑی توپوں اور اُن کی تنظیم میں ہے۔

(خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ یکایک رانی بیٹھ جاتی ہے۔ اور پوری کوشش کرتی ہے کہ دوبارہ طاقت عود کرے۔ راؤ آبا سے کچھ کہنا چاہتی ہے راؤ آبا سرجھکا لیتا ہے)

رانی:۔ صوبے دار صاحب! میں آخری پیغام تمھارے ہاتھ تانتیا کو بھیجتی ہوں۔ جاؤ اور اُسے ڈھونڈھ کر کہدو کہ انگریز کوٹہ کی سرائے کی طرف کمزور ہیں۔ اُنھوں نے ہم کو بے شک ہمارے آدمیوں کی بزدلی کی وجہ سے شکست دیدی ہے۔ کہیں اگر وہ ادھر حملہ کریں تو سپیری تک کے مالک ہوجاویں گے۔ اور اس طرح مغرب کی طرف سے مرہٹہ راج میں داخل ہوجائیں گے۔ لکشمی بائی کا آخری سلام کہنا اور کہنا کہ میں حکم دیتی ہوں کہ جلد حملہ کردیں۔ ورنہ دیر ہوجاوگی اور پھر کچھ نہ ہوسکیگا۔ جلد! جلد! تم اپنی وفادارانہ کارگزاریوں کے لئے دائمی نیکنامی کے مستحق ہوگے۔

(رانی تھک کر گر پڑتی ہے اور راؤ آبا زار و قطار رو کر زمین پر تعظیماً گر پڑتا ہے پھر وہ اُٹھ بیٹھتا ہے

اور جھک کر رانی کے پیر چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے۔ بالآخر اپنا سر جھکاتا ہے اور باغ سے باہر جاتا ہے۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد رانی پھر کسی قدر ہوش میں آجاتی ہے)

رانی :- (آہستہ اور محبت کے ساتھ) انند! انند! جاؤ اور اپنی کتاب پڑھو۔ بیٹے! آج تم نے تلوار کی مشق خوب کی۔ ڈلہوزی صاحب نے جو کہا تھا اُس کو یاد رکھنا۔

(یکایک وہ بیٹھ جاتی ہے اور چلا اُٹھتی ہے۔ کمار انند کی جے۔ اور پھر گنگا بائی کی گود میں جان بحق تسلیم ہوتی ہے)

(رانی کی لاش کو سرائے کے باغ میں پڑی ہے۔ گنگا بائی اُس کے قدموں پر رو رہی ہے۔ برٹش حکام چاروں طرف خاموش کھڑے ہیں۔ جنرل روز اندر آتا ہے۔ اور یکایک لاش کے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ اور کچھ لمحوں تک بغور لاش کو دیکھتا ہے۔ اور سیدھا کھڑا ہو کر اپنی تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے اور رانی کو سلام کرتا ہے۔ دوسرے افسران بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور سپاہی اسلحہ پیش کرتے ہیں۔

تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا

مدت سے ایک تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا ترتیب دے رہی ہوں گو بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ تاہم مجھے خیال ہے کہ ابھی بہت سی خواتین نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے اس لئے سخن گو خواتین سے التماس ہے کہ جلد تر اپنے کلام بلاغت التیام سے معہ اِن حضرات کے اسماء گرامی کے جن سے مشورہ سخن اور اصلاح سخن فرماتی رہی ہیں اور وطن مقام پیدائش مع سن ہجری یا عیسوی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی اب مشاغل کیا ہیں تمام امر کی مفصل کیفیت مرقومہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔

کلام وغیرہ بذریعہ رجسٹری روانہ کریں تاکہ گم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

طاہرہ خاتون ذریعہ سید حسنین صاحب ہیڈ ماسٹر

گورنمنٹ ہائی اسکول بالاگھاٹ (سی۔ پی)

مسئلۂ خلافت

(ہرنام کے قلم سے)

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سلجھے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شایع ہوا تھا مضمون نگار اصحاب میری "شخصیت" کے متعلق بھی زور قلم ضرور صرف کریں گے۔

کوئی کچھ سمجھے۔ مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ باور کرے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعۂ کتب سے شیعی مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے اور میں نے محض ذوق تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اُس کے بارے میں چھان بین کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کرلے کہ میں شیعہ ہوں۔ اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کرکے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوق تحقیق اتنا گم ہوگیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کے دیکھنے کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہوجانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے اُن کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

"نگار" مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار مہینہ کے بعد جولائی کے پرچہ میں میرے نادیدہ کرمفرما سید ابوسعید بزمی صاحب بھوپالی بی اے کا مضمون شائع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدیر نگار کا یہ نوٹ قابل لحاظ تھا کہ "ہرنام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے — ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں — اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے

اس کے بعد قدرۃً مجھے انتظار پیدا ہونا چاہئے تھا اور یقیناً جواب الجواب کے لئے مجھے اُسوقت تک قلم اُٹھانے کا حق نہیں تھا جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اُس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع الخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر دوسرے مضامین اُن کے معیارِ ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شایع کرتے۔

بہرحال اب میرا محورِ نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لئے کہ نگار کے بساط بحث پر سوائے اُسکے کوئی نہیں آیا ہے۔

پہلی بات جسے محل بحث قرار دیا گیا ہے اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور "سیاست ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔

نجانے میری کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلام کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علٰحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار دینا چاہتا ہوں"۔

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ " اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی"۔

اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذرِ تحریر کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانۂ شہادت میں الگ بُلا لئے گئے۔ جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد۔ حد زنا و سرقہ وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کر دی گئیں اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں چیزوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں یعنے امامت کے حقوق کو صرف تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اُس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں ورنہ اُنھیں خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس وغیرہ سے یہ شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ اُنھوں نے صاحبان حقوق کے حق پر ناجایز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اُس پر کوئی ناجایز قبضہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفۂ احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اب ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ " آنحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو سنئے۔

"دُنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا۔ آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرنا اور حدود مملکت کا وسیع کرنا کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا۔ مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت واقتدار کی زیادتی توسیع حدود سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں نہ حق اور نہ ناحق کا سوال ہے۔ نہ عدل و انصاف کی شرط ہے۔ نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

اس کا معیار تفوق صرف جہانگیری و جہاں بانی ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام وقانون کو میں "سیاست الٰہی" کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی۔ لوازم تمدنی۔ انتظامات ملی سب بلندی اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں۔ وہاں اصل مقصد توسیع حدود مملکت کا نہو بلکہ قوم بنائی جارہی ہو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ۔ بے شک قوم کی تشکیل بغیر "قوانین اجتماعی" کے ہوتی ہی نہیں اور اُنھیں قوانین اجتماعی کا نام "نظام سیاسی" ہے۔ لیکن یہ "سیاست" اُس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیت اخلاقی سے علٰحدہ جا ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھئے یا بارگاہ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتقادی یا جو کچھ کہ اُن کے خیال میں حضرت پیغمبر جس طرح اپنے زمانہ کے خود بہترین مصلح انفرادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اُس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اُس کا اصلی طرۂ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے۔

اُنھیں دُنیا کے اس عام اُصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اُسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن اُن کا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اُس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا۔

اُن کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں توسیع ملک۔ فتوحات۔ جاہ و حشمت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملکی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہوگئی اور

وہ باقی نہیں رہی۔

یعنے پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی وقیصری سنتیں قائم ہوگئیں اور اس لئے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حضرت علی کے مختصر دورِ حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناکامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اُسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جو آنحضرت کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا اور اس لئے آپ اجتماعات ملکی وتمدنی میں کلیتہً اُسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبر کا اصلی منشا تھا مگر اُمت اسلامیہ کے عام افراد کی پچیس[۲۵] برس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں خصلتیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اُسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرم کے بعد بلافاصلہ تسلیم کرلی جاتی اور آپ برسرِ اقتدار ہوجاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکیہ" و "سیاست نبویہ" میں کتنا تفرقہ ہے۔

یہ کہنا کہ "حضرت علی ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق ومعاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہوکر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں"۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علی کی شمار کرائی گئی ہیں ان میں سے "متقی" اور "زاہد" اور "فداکار" اور "صحابی" اور "رفیق ومعاون" کی صفتوں میں تو جمہور اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علی کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دیے ہوئے ہے۔ پھر اب رہ کیا جاتا ہے۔ چچیرا بھائی اور داماد ہونا۔ چچیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہلسنت حضرت عثمان حصہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہوکر حضرت علی ہی کے متعلق آنحضرت نے اُن اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اُس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اس کے علاوہ کیا پیغمبر اسلام صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چچیرے بھائی اور داماد ہونے کی

وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں - حالانکہ دوسرے صحابہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں -

اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں - اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادیوں کو اُس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں - (بقول بزمی صاحب) اُس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں - اُس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں - غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے لیکن اس کے باوجود بھی جب موقع پڑتا ہے تو رسول علی کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لئے ویسے اوصاف اور اُتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے صرف اس لئے کہ یہ اُن کے مقابلہ میں رسول کا بھائی اور داماد ہے ـــــ تو پھر اس کا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے ؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے -

میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے -

میں کہتا ہوں کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علی کو اپنا قایم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے - لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہئے کہ آپ کا یہ فعل کسی عزیزداری کے لحاظ اور بیجا پاسداری پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات و خصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف و توصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قایم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں -

اگر ایمان بالنبی جو اسلام کا جزو اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا ہی سمجھنا ضروری ہے -

یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب و غریب ہے کہ "اگر فی الواقع نبی کریم حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہیں کیا -

اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں -

یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ - اُس کے حل کے لئے مستشرقین یورپ کے دامن سے تمسک - میری سمجھ میں تو نہیں آتا - کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی روح کو سمجھ گئے ہیں ؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبر کی ذلت پر جو بہت اعتراضات اُن کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں اُنھیں صحیح تسلیم کیا جائے !

میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل پیش ہی نہیں کئے گئے ہیں بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تزکرہ کیا گیا ہے۔ جناب بزمی صاحب نے مویدین امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ انامدینۃ العلم وعلی بابہا اس کے مقابلہ میں آپ نے چند حدیثیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا بھی انداز ایک غیر جانبدار کو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ سطر کا حوالہ دے دیکر آپ کی کتابوں سے۔ آپ اُس کے جواب میں یہ کہدیتے ہیں کہ ہماری بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں۔۔ (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "فاران" بجنور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی تفسیر۔ حدیث علم رجال وسیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں۔

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ اُن حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر اُن روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش کی لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اُس کے تزکرہ سے نتیجہ کیا؟ "ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے۔ اب آپ بغیر اُس پر کچھ نقد وتبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہدیں کہ "یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے" تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس طرح وقعت دی جائے؟

"سبقت اسلام" کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کے لئے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "ژولیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

"نوجوانی میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے" مگر انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور قوت خیال وساوس واوہام زیادہ پیدا کرتی ہے اس لئے ان تمام شکوک واوہام کے مقابلہ میں کسی حقیقت پر سر تسلیم خم کر دینا کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ "یہ چچیرے بھائی" اور قریب کے عزیز دوسرے بھی موجود تھے لیکن اُنھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہرحال سبقت ایک شرف ہے جو "السابقون السابقون اولئک المقربون" میں معیار تقرب قرار دیا گیا ہے۔ اُس میں عزیز اور غیر عزیز۔ نوعمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے لیکن ہمارا مضمون دیکھ لیا جائے۔ ہم نے اسکو

کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے مضمون کے سلسلۂ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھکر اُس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا!

کہا جارہا ہے کہ "ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا " ان ہذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم " لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار " لیڈر " سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جاسکتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئے کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اُن کو اُس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے"۔

یہ الفاظ جنھیں پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریم مسلمانوں کی نگاہ میں مکار لوگوں کی طرح دنیادار۔ حیلہ باز۔ خود غرض۔ اور ابن الوقت تھے؟ انھوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے کہدیا کہ یہ میرے وصی ہیں۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ اس طرح کام نکال لیا اور ان جملوں کے معنی کچھ بھی نہیں تھے؟

میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ کی سچائی۔ امانت اور دیانت اور بے لوث اخلاق قولی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

اس جگہ حضرت علی کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوڑ طریقہ سے یہ کہدیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علی کو صحیح تسلیم کریگا تو حضرت حسن کو بھی مانیگا لیکن آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اُس کو دیکھکر اُن کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم رہتا ہے۔

اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے سامنے حضرت علی کی خلافت کی بحث میں امام حسن کی امامت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علی کی امامت کو تسلیم کرے اور حضرت حسن کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسن کی نسبت پیش کیا جارہا ہے اُس کو شیعہ فریق فرقۂ خوارج کی اختراع قرار دیتا ہے۔ لہذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اسکے مقابلہ میں وہ متفقہ تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے فجاد سلمی کو زندہ آگ ڈالکر جلوا دیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔

مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے۔ میرا گزشتہ مضمون درحقیقت ابھی تک بالکل کورا ہے اور

اُس تک دست نقد و اعتراض نہیں پہونچا ہے۔

شیعیت کے ایرانی سایۂ تربیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے بنانے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں سے بالکل علحدہ ہے۔

سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر ریمارک کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہی جو آج درخور اعتنا کہا جا سکے اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہیں اسکو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی علمی اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا راہنما قرار دیں اور اُن کے تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی طرح یہ فقرہ کہ "نہ شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"۔

اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق اسی قسم کی تعبیری بنا عقائد کی وجہ سے ہے۔ آپ کہئے گا "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" شیعہ کہیں گے "سنیت اسلام کا مذہبی فرقہ نہیں"۔ نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں۔ یہ کبھی ہو جائے کہ سُنّی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سُنّی غیر ممکن۔۔۔ لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ اُن کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجئے اور اُن کا احترام کیجئے۔ وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں چلئے اس طرح یہ شیرازہ مجتمع رہیگا اور ملت اسلامیہ کا نظام درہم برہم نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں اس لئے اتنا لکھ بھی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

ہرنام

(نگار) "ہرنام" کے مضمون "مسئلۂ خلافت" پر ملک کے اخبارات و رسائل میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مجھے تفصیلی علم نہیں میں تو صرف اسقدر جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں اہل سنت کی طرف سے جو مضامین مجھے موصول ہوئے، ان میں صرف ایک برمی صاحب کا مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا۔ (درانحالیکہ ہرنام کے مضمون کا وہ بھی کوئی معقول جواب نہ تھا) باقی اتنے پست تھے کہ نگار میں ان کی اشاعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں زبانی و تحریری دونوں طرح مجھ پر تقاضہ کیا گیا کہ میں اپنی رائے اس مسئلہ پر ظاہر کروں، لیکن میں نے اس وقت تک اس لئے اس مطالبہ کو پورا نہیں کیا کہ جب شیعہ و سنی دونوں حضرات اپنی اپنی کہہ لیں تو یہ "کافر" اپنی رائے پیش کرے۔

پھر اب کہ اس انتظار میں کافی زمانہ گزر گیا ہے اور ہرنام صاحب کا دوسرا مضمون بھی بزمی صاحب کے جواب میں موصول ہو چکا ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مزید سوال و جواب کے لئے اس بحث کو جاری رکھا جائے، جبکہ اس موضوع پر حقیقتاً نہ سنی اپنے عقاید سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ شیعہ اپنے "حُبِّ علیؓ" کے جذبہ کے ماتحت "بغضِ معاویہ" سے باز آسکتا ہے۔

جس اختلاف کی بنیاد خود رسول اللہؐ کے زمانہ میں پڑ چکی ہو، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے والے اب تیرہ صدی سے زیادہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد کہاں میسر آسکتے ہیں جبکہ وضع احادیث کی ٹکسال نے اس گتھی کو بجائے سلجھانے کے ہمیشہ اُلجھانے ہی کی کوشش کی۔

جیساکہ میں اس سے قبل کی اشاعت میں عرض کر چکا ہوں اس امر کا فیصلہ نہ احادیث سے ممکن ہے اور نہ ان تاریخی روایات سے جن کی بنیاد بھی حدیث پر قایم ہے، کیونکہ دونوں فریق میں سے ہر ایک دوسرے کی پیش کردہ روایات کو غلط قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو دونوں فریق کی روایات کو غلط قرار دیکر یا دونوں کو صحیح سمجھ کر اپنی تحقیق و جستجو کی بنیاد بھی بالکل نئے اُصول پر قایم کرے ـــــ یہی میرا مدعا ہے اور یہی چار و ناچار مجھے کرنا ہے۔

ہرنام کا مضمون شایع کرنے کے بعد میرے متعلق جو رائیں لوگوں نے قائم کیں وہ خلاف توقع نہ تھیں، اہل سنت نے سمجھا کہ میں مصلحتاً شیعہ بننا چاہتا ہوں، حضرات شیعہ نے خیال کیا کہ یہ بدنصیب شیعہ کیا بن سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی نے نہ سوچا کہ وہ شخص جو اب سرے سے مذہب کی ضرورت ہی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، شیعہ و سُنّی کے ان لغو مباحث کو کیا اہمیت دے سکتا ہے اور احادیث پر قائم کئے ہوئے ناکارہ دلایل پر وہ تشیع یا تسنن دونوں میں سے کسی ایک کو کیوں ترجیح دینے لگا۔

بہر حال قبل اس کے کہ میں اس موضوع پر قلم اٹھاؤں، ناظرین نگار کو یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مسلک سنی و شیعہ کے تفرقے سے بہت بلند ہے اور میں جو کچھ لکھوں گا وہ بالکل میری اپنی ذاتی رائے ہوگی، سنیوں کی روایات سے علحدہ، شیعوں کے دلایل سے بالکل جدا ـــ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو نہ سنی ہے نہ شیعہ، نہ ہندو ہے نہ مسلمان، بلکہ ایک انسان ہے اور انسانیت ہی کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔

ہر چند مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے لئے باعث برہمی ہوگا، لیکن سب کچھ یہ برہمی گوارا ہے اور تسنن و تشیع دونوں میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کئے جانے کی ذلت مجھے منظور نہیں۔

جی چاہتا تھا کہ اسی مہینے میں برنام صاحب کے مضمون کے ساتھ ہی اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتا لیکن چونکہ ایک طویل سفر درپیش ہونے کی وجہ سے اور بہت سے کاموں کا ہجوم ہے، اس لئے میں اپنی مفصل رائے ماہ آیندہ تک ملتوی کرتا ہوں۔

اس دوران میں برہمن واڑی حیدر آباد سے ایک اور ہندو (برنام) کا مضمون موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مسئلہ خلافت و امامت پر اپنے بعض شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کا جواب چاہا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا جواب دینا اپنی رائے کو ظاہر کر دینا تھا اس لئے میں نے اسکی اشاعت ملتوی رکھی تھی، اب میں اسی سلسلہ میں ان کو بھی لیلوں گا۔ امید ہے کہ برنام صاحب اس تعویق کو معاف فرمائیں گے۔

اگر برزی صاحب یا کوئی اور ابھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو وقت باقی ہے۔ میں ایک ماہ کی مہلت اور دینے کے لئے طیار ہوں، لیکن یہ خیال رہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ یا تو برنام کے اعتراضات کا کوئی مسکت جواب ہو، یا پھر مذہبی عقاید سے بالکل ہٹ کر ایسا جواب دیا جائے جو شیعہ و سُنی دونوں کو مطمئن کر دینے والا ہو یا یوں۔

حکم قرار دئے جانے دیوالیہ

(دفعہ ۲۷- ایکٹ ۵ سنہ ۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بار ایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷، سنہ ۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان

۱۔ موتی ولد دنی
۲۔ مسماۃ لچھمن زوجہ موتی
} اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

موتی و مسماۃ لچھمن کی درخواست دیوالیہ مورخہ ۲۵ رمئی سنہ ۳۵ء کو پڑھنے اور فریقین کے بیانات کو سُننے کے بعد یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مدیونان مذکور دیوالیہ قرار دئے گئے اور وقت ۶ ماہ کے اندر اپنی درخواست بریت گزرانیں۔

المرقوم ۲۰ر ستمبر ۳۵ء

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

انتقام

کرشن دیال اس زمانہ کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا تھا، اُس نے اپنے بچپن کا زمانہ اپنے والدین کے ساتھ گاؤں میں گزارا جو اپنے خیالات اور عمل کے لحاظ سے بیحد قدامت پسند واقع ہوئے تھے، اس نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پاٹ شالہ میں حاصل کی، اور انگریزی اُسوقت تک شروع نہ کر سکا جب تک وہ تیرہ برس کا ہو گیا، وہ گھر میں عورتوں کے ساتھ مویشیوں کا سا برتاؤ ہوتے ہوئے دیکھنے کا عادی تھا، اس لئے ہر شخص کو حیرت تھی کہ وہ کس طرح جدید خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دینے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

وہ ایک برہمن پنڈت کا لڑکا تھا، یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں رہ کر گزر کر لیتا، لیکن وہ ایک معمولی وظیفہ کی مدد پر کلکتہ انگریزی پڑھنے کے لئے چلا آیا، وہ برہمن ہی نہیں بلکہ کلین برہمن تھا۔ وہ ایک درجن شادیاں کر سکتا تھا، اور اس سے جو کچھ روپیہ ملتا، اس پر اپنی زندگی گزار سکتا تھا لیکن اس نے صرف ایک شادی کی، جب رادھارانی اس کی شریک حیات ہو گئی، تب اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دینے اور کلکتہ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اس کے باپ نے احتجاجاً اس کی امداد بند کر دی، اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی ترک کر دیا، لیکن جب بیٹا ذرا بھی نادم نہ ہوا تو باپ کو بیحد خفت ہوئی۔ کرشن دیال ہوشیار طالب علم تھا، اس نے ہمیشہ وظائف اور ٹیوشن حاصل کئے اور اس طرح کبھی روپیہ کی زیادہ تکلیف نہ اُٹھائی، اُس کی اور اس کی بیوی کی زندگی بہر حال گزر رہی تھی۔ جب اس نے ایم۔ اے پاس کیا اور نوکری ملی، اسی سال اس کے پہلوٹی کی ایک لڑکی راجندر رانی پیدا ہوئی۔

کرشن دیال خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں دُنیاوی دانائی نہیں تھی، لیکن اس کی بیوی رادھارانی نے اپنے شوہر کی معیت و قربت ـــــ سے اپنی یہ خصوصیت زیادہ ضائع نہیں کی تھی، اس نے ایک دن منہ بنا کر کہا:۔ "کیا بیوقوفی ہے، ایک لڑکی اور وہ بھی ایک کلین لڑکی، اس پر اس قدر ناز کرنے سے فایدہ؟ بیکار ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے ـــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمر بیٹھی رہیگی، آج کل ایک معقول بر ڈھونڈھنا بہت مشکل ہے۔ بہت سے لوگ تھوڑی رقم کی وجہ سے اپنی لڑکیاں نیچ گھرانوں میں بیاہ دیتے ہیں۔

"کیا بُرائی ہے" کرشن دیال نے کہا "ہمیں اس وقت رنج ہوتا ہے جب لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔ اس سے تو لڑکیاں اگر اپنے والدین کے ہی یہاں رہیں تو اچھا ہے"

رادھارانی کا شاداب چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے کہا:۔ تم ایک بچے کے باپ ہو چکے ہو اور تم اب بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں کب عقل آئے گی؟

کرشن دیال نے ہنسی میں بات ڈال کر گفتگو ختم کر دی۔ لیکن اُسے دل ہی دل میں یہ سوچ ضرور پیدا ہوگیا کہ کہیں اس کی لڑکی، بیوی اور اس کے درمیان، نزاع کا باعث نہ ہو جائے۔

راجندر رانی بڑی ہوتی گئی اور والدین کی محبت میں بگڑتی بھی گئی، اس کے دو چھوٹے بھائی اور پیدا ہوئے اور اس طرح رادھارانی کی تمنائیں بہت کچھ پوری ہوگئیں لیکن اسے یہ شکایت بدستور رہی کہ راجندر رانی کو اسکے باپ نے بالکل بگاڑ دیا ہے۔ وہ اکثر شوہر سے کہتی:۔ "تم نے لڑکی کا بالکل چوچلوں میں ناس کر دیا بتاؤ اس کا کیا حشر ہوگا۔ لڑکیوں کو بہت منھ نہیں لگانا چاہئے بلکہ انھیں نظر انداز کر دینا بہتر ہے۔ اس طرح اگر انھیں آیندہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ آسانی سے بھوگت لیں گی"

تو تمھاری منطق کے بموجب اُنھیں فاقے کرانا چاہئیں، اس اندیشہ سے کہ شاید اُنھیں آیندہ آسودگی سے کھانے کو نہ ملے"

رادھارانی کے الفاظ پرزور تھے لیکن اس کے دلائل میں زور نہ تھا، اس لئے وہ کچھ دیر کے بعد اپنے شوہر کو "الفاظ کا بادشاہ" اور "باتیں ملانے والا" کہکر خاموش ہو جاتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن دیال نے تھوڑا سا اپنی لڑکی کو بگاڑ ضرور دیا تھا لیکن وہ اس کی تعلیم کی طرف سے بے خبر نہ تھا۔ وہ اُسے خود بھی پڑھاتا اور ایک علٰحدہ اُستانی بھی اُس نے سینا پرونا اور گانا سکھانے کے لئے مقرر کر دی تھی، چند روشن خیال برہمو خاندانوں کو چھوڑ کر اس زمانہ میں کسی لڑکی کو یہ باتیں نہیں سکھائی جاتی تھیں اسی لئے کرشن دیال کے لئے یہ مشہور ہوگیا کہ وہ بالکل عیسائی ہوگیا ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے اسے انتہائی تکبر کے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن وہ اب بھی مالی امداد کے خواہشمند ہوتے اور جب کلکتہ آتے تو اس کے یہاں ٹھہرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

راجندر رانی پورے بارہ سال کی ہوگئی ــ اس مرتبہ دونوں میاں بیوی میں خوب لڑائی ہوئی، رادھارانی نے عہد کر لیا کہ وہ جس طرح ہوگا لڑکی کی شادی کر دے گی۔ اس کا شوہر بیوقوف تھا، اس نے طے کر لیا کہ وہ اُسکی پیروی نہ کرے گی۔ اُس نے اپنے عزیزوں کی مدد سے راجندر رانی کے لئے شوہر کی تلاش شروع کر دی۔ کرشن دیال جمارہا اور اُس نے وہ تمام معقول پیام جو اس کی بیوی نے جمع کئے تھے، ایک ایک کر کے رد کر دئے۔

رادھارانی پھر ایک لفظی جنگ کے لئے آمادہ ہوگئی "ہاں تو تمھارا ارادہ کیا ہے۔ کیا لڑکی کو عمر بھر بٹھائے رکھنے کی ٹھانی ہے؟" اس نے خطرناک سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں اُسے دریا میں جھونکنے سے رہا۔ میں کس سے اس کی شادی کروں؟"

"کیوں، میں نے اتنے لڑکے بتلائے، ان میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ تمھاری لڑکی کہیں کی شہزادی تو ہے نہیں کہ اُس کا اسقدر خیال کیا جاوے"۔

"میں نے تم سے ہزار بار کہدیا کہ میں اسقدر کم عمری میں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتا، پھر تمھیں کیوں خواہ مخواہ ضد ہے کہ جو کوئی ملے اس سے تم اس کی شادی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ میں نے اسی لئے ہر ایک پیام کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے رد کر دیا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ایک کلین برہمن کی لڑکی ساٹھ برس تک بلکہ ساری عمر بغیر کسی بدنامی کے کنواری رہ سکتی ہے۔ پھر تم کیوں آخر اسقدر خفا اور پریشان ہو"۔

"اگر تم میری بات سمجھتے تو مجھے ذرا بھی دقت نہوتی ــــ تمھاری لڑکی برہمو اور عیسائی لڑکیوں سے زیادہ بے حجاب ہوتی جارہی ہے۔ اگر تم اسے زیادہ عمر تک کنواری رکھو گے تو وہ خود اپنی پسند کی شادی کرے گی اور پھر اگر اسنے کسی خراب گھر کے لڑکے کو پسند کیا تب؟"

"وہی سب سے اچھا گھر ہوگا، جس کو وہ خود پسند کرے گی"۔

"تمھاری طرح نا ــــ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کی شریف گھرانے اور اچھی ذات کے لوگوں میں شادی ہو"۔

"لڑکی خود ہر بات دیکھے گی۔ اپنے انتخاب سے تکلیف اُٹھانا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کی پسند کا غلام ہو کر عمر بھر عیش سے گزار دے۔

غرض دونوں میں اسی طرح کی نوک جھونک قائم رہی ــــ راجندر رانی جوان ہوتی گئی ــــ اُسے بتھون اسکول میں داخل کر دیا گیا اس لئے کہ کرشن دیال کو اب پڑھانے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ آیندہ سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی، اُس نے ہر شخص سے کہدیا کہ وہ یقینی پاس ہوگی اور پھر کالج میں داخلہ کرا لیگی وہ اکثر اپنے بھائیوں کو تنگ کرتی اس لئے کہ جہاں تک پڑھنے کا تعلق تھا، اس کا اور اُن کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ اس کی ماں ان حرکتوں سے بہت ناراض ہوتی لیکن پھر بھی ایک تبسم صرف کئے بغیر نہ رہتی ــــ راجندر رانی کی عمر میں وہ ماں بن چکی تھی۔

کرشن دیال محض عورتوں کی تعلیم ہی کا حامی نہ تھا بلکہ آزادیٔ نسواں کا بھی موافق تھا، رادھارانی سوائے اپنے عزیزوں کے ہر شخص سے پردہ کرتی تھی۔ جو لوگ بہت بوڑھے اور ضعیف ہوتے تھے اُن کے سامنے بھی

وہ گھونگھٹ نکال کر جاتی تھی، مگر راجندر رانی نے کبھی اس قسم کی عادتیں اختیار نہیں کیں۔ وہ ہر شخص کے سامنے آتی تھی، اور ہر شخص سے بات کرتی تھی۔ ایک نوجوان رانیندر، اس کے دونوں بھائیوں کو شام کے وقت پڑھاتا تھا۔ وہ اس سے بے حجابانہ گفتگو کرتی اور اکثر پڑھائی میں اس کی مدد لینے سے احتراز نہ کرتی، رادھارانی کو یہ باتیں بہت ناپسند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے اسقدر بگاڑ دیا ہے کہ اب زجر و ملامت بیکار ہے۔ رانیندر برا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک معقول اور مالدار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کے اطوار نہایت پاکیزہ اور شریفانہ تھے۔ اسے اپنے باپ سے کچھ اختلاف تھا اور اسی بنا پر گھر بار چھوڑ دیا تھا اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب خود کما کر زندگی بسر کرے گا، چنانچہ اب وہ ٹیوشن کر کے گزارہ کر رہا تھا، وہ لڑکوں کو پڑھانے کیلئے رکھا گیا تھا لیکن دراصل وہ اپنا زیادہ وقت راجندر رانی کو دیتا تھا۔ اور یہ کئی مہینے سے ہو رہا تھا۔

پہلے پہلے تو رادھارانی اس سے چشم پوشی کرتی رہی، اگرچہ اس نے کبھی یہ سلسلہ پسند نہیں کیا لیکن رفتہ رفتہ یہ اس پر ظاہر ہونے لگا کہ اب معاملات اس کے قبضۂ اختیار سے باہر نکل گئے ہیں اس نے سوچا کہ اگر راجندر رانی کو روکا نہ گیا تو خدا معلوم وہ کیا سے کیا کر بیٹھے۔ شوہر سے اسے کسی مدد کی توقع نہ تھی اس لئے کہ وہ لڑکی کی ہر زیادتی پر ہمت افزائی کے لئے آمادہ تھا۔

راجندر رانی کی جانچ کا امتحان ہونے والا تھا، اس لئے اس نے نومبر سے ہی سخت محنت شروع کر دی وہ ذرا بھی آرام نہ کرنا چاہتی تھی اور نہ نرنیندر اسے آرام کرنے دیتا تھا۔ راجندر رانی کے بھائی البتہ مسلسل آرام کر رہے تھے۔

رادھارانی کبھی کبھی اپنے بچوں کی پڑھائی دیکھنے کے لئے باورچی خانہ کا کام چھوڑ کر چلی آتی تھی۔ وہ روزانہ ایک ہی منظر دیکھتی —— راجندر رانی پڑھتی ہوتی، نرنیندر اسے بتاتا ہوتا، دونوں لڑکے بیرن اور ہیرن ہر قسم کی شوخیوں میں مشغول ہوتے۔ رادھارانی نرنیندر کے سامنے نہیں آتی تھی اس لئے باوجود ناگواری کے خاموش رہی۔

لیکن ایک روز اسے اپنا سکوت توڑنا پڑا۔ وہ حسب دستور دروازہ میں سے جھانک رہی تھی کہ اس نے راجندر رانی کو دیکھا کہ سوال نکال رہی ہے اور نرنیندر اپنی تمام روح کو آنکھوں میں لئے ہوئے اسے برابر دیکھ رہا ہے۔ لڑکے حسب معمول ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

رادھارانی اس منظر کی تاب نہ لا سکی، اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اپنے اوپر قابو نہ پاکر، وہ دوسرے کمرے میں زور سے چلائی:۔ "لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں یہی مناسب ہے، اگر ہمیں لڑکی کیلئے ماسٹر کی ضرورت ہوگی، تو ہم خود رکھ لیں گے۔" وہ زور سے کمرہ کے باہر چلی گئی —— تھوڑی دیر میں نوکرانی آئی

اور راجندر رانی سے کہا:۔ "چلئے بی بی آپ کو اندر بلا رہی ہیں"۔

اس مداخلت نے غیر متوقع نتائج پیدا کئے راجندر رانی، رامیندر سے الگ رہنے پر مجبور کی گئی۔ لیکن اس جبریہ علٰحدگی نے اسے اپنے احساسات کا اندازہ کرنے کا موقع دیا۔ اُسے اپنی جراحتوں اور بے چینیوں کو معلوم کر کے حیرت تھی، رامیندر روزانہ لڑکوں کو پڑھانے آتا تھا۔ لیکن اس کا ذرا بھی جی نہ لگتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام پورا کرتا اور چلا جاتا۔ کبھی کبھار راجندر رانی کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور کبھی وہ بھی نہیں۔ رادھا رانی نے اپنے شوہر کو یہ سمجھا دیا تھا کہ راجندر رانی کی موجودگی بچوں کی تعلیم میں بہت حارج ہوتی ہے، اس لئے اسنے اُس کو وہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔ کرشن دیال کو اس کا یقین آگیا تھا اور اس نے راجندر رانی سے کہدیا تھا کہ وہ خود اس کو پڑھائے گا اگر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوگی۔

اس طرح دو تین مہینے گزر گئے۔ راجندر رانی نے جانچ کا امتحان بھی پاس کر لیا اور میٹرک بھی۔ لیکن اتنے اچھے طریقہ سے نہیں جیسی کہ اسے توقع تھی۔ اس کی صحت بھی دفعتًا خراب ہونے لگی۔

رادھا رانی کو ان سب باتوں کا گمان پہلے ہی سے تھا، آخر تو وہ اُس کی ماں تھی، —— اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اس کے غصہ کی انتہا ہوگئی۔ وہ دوڑتی ہوئی شوہر کے پاس گئی اور کہا:۔ "اب تمھیں صبر آیا؟۔ اس غریب کا آخر کیا ہونا ہے؟"

"تمھیں اسقدر کیوں اُلجھن ہے —— اگر تمھارا گمان صحیح بھی ہے تو اس میں اسقدر غصہ کی کیا بات ہے نرمیندر سے شادی کرنے میں کیا برائی ہے؟"

"خوب یہ کس طرح ممکن ہے، تم ذات، مذہب، برادری کنبہ ہر چیز قربان کر دینا چاہتے ہو"۔

"کیوں، وہ بھی تو برہمن ہے"۔

"برہمن!" رادھا رانی نے غضبناک ہو کر کہا:۔ "اگر جیکر دتی بھی برہمن ہونے لگے تو تمھارے یہاں جھینگر بھی چڑیاں کہلانے لگیں گی۔ مجھے یہ شوخیاں نہیں بھاتیں، اگر تمھیں یہی کرنا ہے تو مجھے پہلے سے بتا دو تاکہ میں کہیں کو منھ کالا کر جاؤں"۔

"لیکن خاندان سے زیادہ شخص خاص کا خیال کرنا چاہئے۔ کیا ایک بڑے خاندان سے کسی رذیل کو تجویز کر لینا، ایک چھوٹے خاندان سے شریف کے تجویز کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے؟ بتاؤ کون لڑکی کو زیادہ خوش رکھ سکے گا"۔

"یہ سب قسمت کی باتیں ہیں"۔ رادھا رانی نے عقلمندانہ انداز میں کہا "ایک لڑکی کی مسرت خود اسکے بنائے نہیں بنتی —— وہ بے حیا لڑکیاں جو خود شوہروں کا انتخاب کرتی ہیں وہ بھی سب کی سب خوش نہیں رہتیں

اور نہ ہم، جنھیں ہمارے والدین بیاہتے ہیں، سب کی سب اسقدر آزردہ ہوتی ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمیں جو بڑوں سے ہوتی آئی ہے، اُسے نہ چھوڑنا چاہئے۔"

"یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون خوش ہے اور کون ناخوش" کرشن دیال نے کہا۔ "اس لئے کہ اس بارہ میں کسی قسم کے اعداد شمار سرکاری یا غیر سرکاری حاصل نہیں ہیں۔ میں تمھیں اپنی رائے بتا چکا ہوں میرے نزدیک اپنے انتخاب کے باعث تکلیف اُٹھانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے دوسروں کے غلام ہوکر تمام عمر چین سے گزار دی جائے۔

رادھا رانی ذرا بھی مطمئن نہ ہوئی۔ اس نے یہ نزاع برابر قایم رکھی، اس نے بار بار یہ بات دھرائی کہ وہ اس سال کے اندر اندر راجندر رانی کی شادی کر دے گی۔ اب وہ کسی کی بھی نہیں سُنے گی۔ اسکے خاندان کی کوئی لڑکی کالج میں پڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتی، اگر وہ ہر معاملہ میں اس طرح ڈھیل دئے جائے گی تو وہ خاندان میں منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گی ــــ کرشن دیال سنجیدگی کے ساتھ اُٹھا اور چلا گیا۔

اب گھر کی فضا غیر یقینی ہوتی جا رہی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی جو طوفان اُٹھنے سے قبل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اس لئے کہ کرشن دیال ذرا الگ ہی الگ رہا لیکن کوئی مفاہمت کی صورت بھی نہ تھی۔

بچے پوری پوری چھٹی منا رہے تھے۔ ہر شخص کو اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا وقت کس طرح گزارے۔ غریب راجندر رانی کے لئے یہ سوال سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، اس کا نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ اُسے کوئی کام تھا۔ زندگی اب اس کے لئے ریگزار کی سی وحشت کا نام تھا۔ رانیندر کو اس کے باپ نے بلا لیا تھا۔ اس لئے وہ گھر چلا گیا تھا۔ بچوں کے پاس وہ اپنا پتہ چھوڑ گیا تھا لیکن اُن کے دل میں کبھی اُسے لکھنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔ راجندر رانی اس کا حال معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی۔ اگر اس کی آنکھیں حرف دو لفظ اسکے لکھے ہوئے دیکھ لیتی تو اُسے تسکین ہو جاتی، لیکن وہ ایک بنگالی لڑکی تھی جو خاموشی ہی کے ساتھ مصیبتیں جھیلنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

راجندر رانی پہلے گھر کے کام میں ماں کو تھوڑی بہت مدد دیا کرتی تھی۔ اب رادھا رانی اس سے زیادہ امداد کی متمنی تھی اس لئے کہ وہ اسکول سے فارغ تھی لیکن اس کی ماں کو بالکل ناامید ہونا پڑا۔ اب اُسے گھر کے کام میں ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ راجندر رانی اس سے قبل گھر کو آئینہ کی مانند صاف اور ستھرا رکھتی تھی لیکن اب وہ ہفتہ میں چھ دن تک ہر چیز بے التفاتی کے ساتھ پڑی رہنے دیا کرتی تھی۔

تاہم وہ ایک دن ڈرائنگ روم اور مطالعہ کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے باپ کی

میز حسب دستور اس کے لئے ذوق نگاہ کا سامان رکھتی تھی، اُسے ہمیشہ یہ کونہ صاف کرنے میں دیر لگتی تھی، وہ بڑی بڑی کتابوں کی گرد صاف کرکے اُن کو ترتیب دینے سے قبل اُن کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ کہ ایک کتاب میں سے ایک لفافہ گرا، اس نے فوراً اُٹھالیا، اس کے طرز تحریر سے وہ آشنا تھی ـــ وہ اُسے بیحد عزیز تھا۔

یہ خط اس کے باپ کو لکھا گیا تھا، وہ کبھی اس کا مضمون دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوتی لیکن ایک "جذبۂ بے اختیار شوق" نے اچھے بُرے کی تمیز اُٹھا دی ـــ اس نے لفافہ چاک کیا اور دم بخود ہو کر پڑھنا شروع کر دیا۔

اُس نے پورا کمرہ صاف نہیں کیا، کسی نہ کسی طرح اس نے خط اس کی جگہ واپس رکھدیا، گئی اور جاکر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ رادھا رانی نے کچھ دیر بعد راجندر رانی کو وہاں دیکھکر مضطربانہ پوچھا:- "کیوں، کیا بات ہے؟"

راجندر رانی نے دیوار کی طرف منھ کئے ہوئے کہا "میری طبیعت بہت خراب ہے"۔ کامل دو روز تک وہ اپنے کمرہ میں رہی، نہ اُٹھی، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا۔ حتی کہ کسی کو دیکھنے کی بھی متحمل نہ ہوئی۔

یہ خط جس کا ذکر ہے، رانیندر نے کرشن دیال کے کسی خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ بچوں کو پڑھانے سے معذور ہے اس لئے کہ اس کے باپ نے اُسے گھر بلا لیا ہے اور اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ اس نے کرشن دیال کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اُسے داماد بنانے کے لائق سمجھا لیکن چونکہ اس کے باپ نے اس کی شادی دوسری جگہ ٹھہرا دی ہے اس لئے وہ افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہے۔ آج کل چونکہ اس کا باپ پریشانیوں میں مبتلا ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو رد کرکے اُس کو رنج پہونچانا نہیں چاہتا۔

ایک انسان ہمیشہ رنج و غم میں بسر نہیں کر سکتا ـــ راجندر رانی کا غم کم ضرور ہوا لیکن اس کا شباب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ وہ ایک معمر عورت کی طرح سنجیدہ اور متین ہو گئی کچھ عرصہ میں رانیندر کی شادی کا دعوت نامہ آگیا اسی دن راجندر رانی اپنے باپ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ کالج لے گئی اور داخلہ کرا لیا۔ رادھا رانی نے بہت کچھ ہائے ویلا مچائی لیکن اُس نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اس کے بعد وہ گویا صرف اپنی تعلیم کے لئے زندہ تھی، لیکن راجندر رانی کی قسمت میں شاید سکون تھا ہی نہیں۔ ابھی سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ کرشن دیال بہت سخت بیمار ہوا ـــ رادھا رانی کی آہ و بکا نے فضا کو اور مکدر کر دیا۔ وہ پھر آئے گئے کے سامنے سسکیاں لے لے کر اس "بار گراں" کی شکایت کرتی جو اس کا شوہر اُس کے اوپر چھوڑے جا رہا ہے۔

راجندر رانی کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی، اُس کے اور اُس کی ماں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں تھے اب یہ ہر وقت کے طعنوں اور حوالوں نے اس کا دل چھلنی کر دیا۔ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ ایک دن بیخ اُٹھی:- "تو پھر تم میری شادی کر کیوں نہیں دیتیں۔ اس گھر سے تو کم از کم کوئی گھر خراب نہ ہوگا"۔

ان الفاظ پر رادھا رانی کے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی، لیکن وہ انھیں بھولی نہیں ـــ بہت سی

حجامنیں اور نائنیں آئیں، بہت سی باتیں ہوئیں - کرشن دیال اس قدر بیمار تھا کہ وہ کسی رائے کا اظہار ہی نہ کر سکا۔ اس لئے تمام معاملات کم وبیش راجند رانی ہی کی خواہش کے بموجب طے ہوئے۔ بہت سے اچھے اور برے پیاموں میں سے اس نے ایک شخص کو پسند کیا جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور جس کی عمر بہت زیادہ تھی۔ جس کے کوئی بچہ نہ تھا۔

ہر شخص کو اس کے انتخاب پر حیرت تھی، اور ہر شخص اس بات کا خواہشمند تھا کہ کسی طرح وہ اپنی رائے تبدیل کر دے لیکن اس سنگدل میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی —— "اگر تمھیں میری شادی کرنا ہے تو سمجھ لو کہ میں اُسی شخص سے شادی کروں گی اور کسی سے نہیں" اس نے ایک آہنی عزم کے ساتھ صاف کہدیا۔

چنانچہ راجند رانی کی شادی اسی معمر شخص سے ہوگئی۔ رخصتی کے وقت رادھا رانی نے اپنے آہ ونالہ کی انتہا کر دی لیکن راجند رانی کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ البتہ جب وہ اپنے نیم بیہوش باپ کے سامنے بادب جھکی، اسوقت وہ لوگوں سے چھپا کر اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

وہ اپنے نئے گھر اُسی "سنگین" چہرہ کے ساتھ آگئی، گھر کی عورتوں نے تمام رسمیں برتیں۔ سنئے عزیز تعارف کے لئے آئے۔ وہ عمر میں چھوٹی تھی، لیکن گھر میں بہت سے لوگوں کی بڑی تھی اسی لئے وہ ایک سکون آمیز طمانیت اور بردباری کے ساتھ کھڑی رہی اور دونوں اصناف اور ہر عمر کے لوگوں کے آداب قبول کرتی رہی۔ ایک نند کھڑی ہوئی سب کا تعارف کرا رہی تھی۔ راجند رانی نے جب ایک شخص کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور صورت سے ملول معلوم ہو رہا تھا۔ "یہ تمھارا بھتیجا نریندر ہے" نند نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ نریندر نے ظاہر دارانہ طور پر آداب کیا اور جلدی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔

راجند رانی بڑی لڑکی تھی، اس لئے سسرال سے زیادہ عرصہ الگ رہنے کا کوئی عذر نہیں ہو سکتا تھا وہ ایک دو روز کو میکہ گئی اور پھر آگئی۔ جس دن کرشن دیال کا انتقال ہوا، وہ پھر ماں کے گھر چلی آئی تھی خوش قسمتی سے کرشن دیال کا انتقال بغیر دوبارہ ہوش میں آئے ہو گیا اور اسے یہ کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ اُس کی چہیتی بیٹی نے جان بوجھ کر زندگی بھر کا ایک عذاب اپنے سر مول لے لیا ہے۔

راجند رانی اُسی دن واپس آگئی۔ وہ اپنے گھر سے زیادہ وقت کے لئے الگ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی ایک دن کے لئے بھی گھر کا دیکھنے والا نہ تھا۔ اسی لئے اُس کے شوہر نے ایک جوان اور تعلیم یافتہ عورت سے شادی کی تھی جو آتے ہی گھر کی مالک بن جائے۔

چوتھے دن اس نے اپنے باپ کی سردھ بڑے پیمانہ پر کی۔ وہ پچھلی رات نہ سو سکی تھی اس لئے کہ اپنے مرحوم باپ کی یاد میں برابر آنسوؤں کے ہار پروتی رہی۔ لیکن صبح کو اس کا چہرہ بالکل بے اثر تھا۔ جس پر رنج وغم کے

ذرا بھی آثار نہیں تھے - مہمانوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آپس میں کہنے لگے "عجیب عورت ہے! اس کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند بھی نہیں - ایک عورت کو اس قدر سنگدل نہیں ہونا چاہیئے"۔

تمام دن قریب قریب مہمانوں کو کھانا کھلانے میں صرف ہو گیا۔ شام کو قدرے خاموشی ہو گئی۔ راجندر رانی اُس برآمدہ میں تنہا بیٹھی تھی جو اس کے سونے کے کمرے کے سامنے تھا۔ اس کا شوہر نیچے مہمانوں کے ساتھ تھا۔ اسوقت دفعتًا نریندر آیا۔ وہ راجندر رانی کے قریب آیا اور کہا:۔ "میں ان دنوں برابر تنہائی کا موقع ڈھونڈھتا رہا لیکن نہیں ملا۔ کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، تم مجھے حقارت کے لائق بھی نہ سمجھ کر آسانی سے بھول جاتیں"۔

راجندر رانی شاید اپنی شادی کے بعد پہلی بار ہنسی "میں نے تم سے دو باتیں سیکھی ہیں" اُس نے کہا "ایک یہ کہ آدمی کو اپنے والدین کے خلاف کبھی کچھ نہ کرنا چاہیئے اور دوسرے، یہ کہ روپیہ دنیا میں ہر چیز کے مقابلہ میں بڑی چیز ہے"۔

نریندر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہا "میرے قصور کے لئے میرے سارے گھر والوں کو تو خطا دار نہ ٹھہراؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ ہماری سب کی زندگی کا سہارا اور بھروسا چچا ہی جی ہیں"۔

"لیکن مجھے اپنے برے بھلے کو پہلے دیکھنا چاہیئے"۔ راجندر رانی نے کہا۔

رانیندر نے زیادہ گفتگو بیکار سمجھی - آج اُسے اپنے گناہ کبیرہ کا احساس ہوا۔ ایک وہ لڑکی جو پھول کی طرح نرم و نازک تھی اور نسیم سحری کی طرح پاکیزہ — آج وہ اس حرکت کی وجہ سے ناگن کی طرح بیرحم اور پتھر کی طرح جامد و سخت ہو گئی تھی — اب وہ مجبور تھا، ایک سنگین مجسمہ کے اندر وہ روح نہیں ڈال سکتا تھا وہ آہستہ سے چلا گیا۔

رادھا رانی اپنی لڑکی کی عقل کا ماتم کرتی رہی، لیکن اُسے اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اُس سے زیادہ ہوشیار رہے گی — ایک سال ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ راجندر رانی گھر کی تنہا مالکہ ہو گئی اور اُس تمام دولت کی قابض جو اس کے بوڑھے شوہر کی ملکیت تھی۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ اُس نے کس طرح کیا۔ تمام وابستگان کو الگ کر دیا انھوں نے بہتیرا برا بھلا کہا، کوسنے دیئے لیکن راجندر رانی نے ذرا پرواہ نہ کی۔ رادھا رانی ان کو سنوں پر کانپ اٹھتی لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ راجندر رانی نے اُس سے تمام تعلقات قطع کر لئے تھے اسی طرح برس گزر گئے —

ایک دن رادھا رانی اپنی لڑکی کے گھر روتی ہوئی آئی اور اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔ راجندر رانی بھی اب بیوہ تھی، وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اُسے ماں کے آنسو پسند نہ آئے

اور اس نے کہا:- تم کیوں روتی ہو، انسان کو بہر حال ایک نہ ایک دن مرنا ہے" رادھا رانی کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "کیا تم پتھر کی بنی ہوئی ہو؟" اُس نے پوچھا "وہ پھر بھی تمہارا شوہر تھا۔ تم اتنے عرصہ اس کے ساتھ رہی ہو۔ کیا اس کے لئے ذرا بھی دُکھ نہیں محسوس کرتیں"

راجندر رانی نے خشمگیں چہرہ بنالیا اور ماں کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔

اُسے اپنی ماں کا مکان ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ وہ اب اس گھر کی تھی ہی نہیں لیکن اب وہ کہاں رہے؟ خود اپنا بڑا مکان سنسان اور ویران تھا، وہاں تنہا رہنے کی اس کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اُسکے پاس کافی دولت تھی۔ اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اُس کی گزرگاہ بر تصور ایک بے آب و گیاہ سرزمین ہی تھی۔

وہ رفتہ رفتہ بالکل بت ہوتی جا رہی تھی ـــ ساکت اور جامد ـــ اس کی ماں خفا بھی ہوئی کہ "اس قدر احساس نہ کرو۔ ذرا مجھے دیکھو اور صبر حاصل کرو۔ اگر قسمت سخت سے سخت مصیبتیں بھی ڈالے تب بھی زندہ رہنے کے لئے برداشت کرنا پڑتی ہیں"۔

"کیا تم میرے بھتیجے نریندر کو ایک دفعہ کے لئے بلا دوگی؟" راجندر رانی نے پوچھا،

"کیوں اب تمھیں اُس سے کیا لینا ہے؟" ماں نے سخت آواز میں کہا۔

رادھا رانی نے مجبوراً اپنے چھوٹے لڑکے کو رانیندر کے بلانے کے لئے بھیجدیا۔

رانیندر نے اول اول آنے سے انکار کیا۔ لیکن لڑکا بغیر اس کے سرکنے والا نہیں تھا اس لئے وہ مجبوراً آگیا۔ بیرنندر نے اُسے ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بہن کو بلوایا۔ راجندر رانی اپنے ٹرنک میں سے ایک بھاری لفافہ نکال کر، رانیندر کے پاس پہونچی۔ جب وہ داخل ہوئی رانیندر کھڑا ہوگیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

راجندر رانی نے لفافہ اُس کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھایا "اسے حفاظت سے رکھنا"۔ رانیندر اس کو قبول کرنے سے پہلے ذرا گھبرایا۔

"یہ کیا ہے" اُس نے پوچھا۔

"یہ ایک دستاویزی تحفہ ہے" راجندر رانی نے کہا "جو میں نے دوسروں کا چرایا تھا، وہ میں واپس کرتی ہوں"۔

"کیوں؟ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" رانیندر نے پوچھا ـــ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "ابھی ہم مرے نہیں، تمہارا انتقام تو غیر مکمل رہے گا"۔

"نہیں اب یہ مکمل ہو چکا ہے۔ تم نے دولت کے غرور میں ایک عورت کے جذبات کو اسقدر مجروح کیا

کہ وہ موت کی طلبگار ہو گئی۔ لیکن اب تمھیں اُسی عورت سے ایک فقیر کی طرح یہ بھیک قبول کرنا ہے"۔
نریندر اس عطیہ کو پھینک دینا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ رُک گیا۔ سخت افلاس نے اس کے جذبات سرد کر دئے تھے۔

نریندر کچھ فاصلہ سے کھڑا تھا۔ وہ اب قریب آیا اور کہا "تم بالکل ترک وانکار پر آمادہ ہو تم آخر زندگی کس طرح گزار و گی؟"

"تم اندیشہ نہ کرو" راجندرانی نے کہا "میں تمھارے اوپر نہیں رہوں گی۔ ماں نے مجھے غلامانہ تابعداری کا سبق سکھایا اور باپ نے وحشیانہ آزادی کا۔ لیکن ان میں سے ایک چیز بھی میرے سکون کا باعث نہ ہوئی مجھے ایک دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا"۔

"تم کہاں جاؤ گی؟ راجندرانی" نریندر نے دریافت کیا۔

"میں نے محبت کے راستہ میں بھی غلطی کی اور انتقام کے راستہ میں بھی۔ میں کوئی اور راستہ ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گی۔ میں یہ مکان آج ہی رات کو چھوڑ دوں گی"۔

"کیا تم مجھے اپنا پتہ دیتی جاؤ گی؟" نریندر نے پوچھا۔

"نہیں" راجندرانی نے مختصراً کہا۔

(ترجمہ) خواجہ احمد فاروقی۔ بچھرایونی

مکتوبات نیاز

ادب وانشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف

مکتوبات نیاز

میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱عہ ۲ر۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے

منیجر نگار۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

شاعری کا معیار صحیح اور غالبؔ

(جناب لطافت حسین صاحب - مراد آباد)

میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے نزدیک شاعری کا صحیح معیار کیا ہے اور غالبؔ کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں ـــ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو بہت کم شعر کسی کی غزل کے پسند آتے ہیں اس لئے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کن اُصول کے ماتحت حُسن و قبح پر حکم لگاتے ہیں۔ ممکن ہو تو غالبؔ ہی کے اشعار مثالاً پیش کرکے جواب دیجئے۔

(نگار) آپ کے سوال کا جزو اول جس تفصیلی جواب کا مقتضی ہے اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں، لیکن جزو ثانی چونکہ ایک محدود و متعین بحث سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے میں فی الحال اس کی طرف توجہ کرتا ہوں اور یہی غالباً آپ کا بھی مقصود ہوگا۔

یہ بالکل درست ہے کہ مجھے بہت کم شعر پسند آتے ہیں، لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب میں کیا دوں جبکہ اس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہے اور الفاظ سے ظاہر کرنے کی چیز نہیں۔ تاہم چونکہ ہر ذوق ایک استدلال خفی بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے، اسلئے میں دو چار مثالیں پیش کرکے اس کو واضح کرنے کی کوشش کرونگا۔

جسوقت غزل کا کوئی شعر میری نگاہ سے گزرتا ہے، تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کس خیال کو پیش کیا گیا ہے اور اگر وہ خیال اچھا ہے تو پھر انتخاب الفاظ و انداز بیان کو دیکھتا ہوں کہ وہ اصل جذبہ کو کماحقہ ظاہر کرتا ہے یا نہیں ـــ اگر ان دونوں میں کامل توافق پاتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مکمل ہے، اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو اسی نسبت سے اس کے حسن و قبح پر حکم لگاتا ہوں۔

اب رہا یہ امر کہ میں کس خیال یا جذبہ کو پسند کرتا ہوں اور کس اصول پر اسلوب بیان کی ہمواری یا ناہمواری

پر حکم لگاتا ہوں، اس کے تمام جزئیات کی تفصیل تو دشوار ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرے نزدیک وہی جذبہ زیادہ پسندیدہ ہے جو واقعیت سے زیادہ قریب ہے اور اس لئے وہی اسلوب بیان مجھے پسند آنا چاہئے جو اس حقیقت سے زیادہ متاثر کرنے والا ہو۔ خیال کی دقت اور بیان کی ژولیدگی غزل میں میرے نزدیک نہایت مکروہ چیز ہے۔ ایک غزل کے شعر کا لطف یہ ہے کہ اس کو سنتے ہی مفہوم ذہن نشین ہو جائے اور انسان کو سوچنا نہ پڑے کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور الفاظ سے اس کا مدعا کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ الغرض خیال کی پاکیزگی اور انداز بیان کی حلاوت و سلاست جب دونوں پورے توازن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جائینگی تو میں اسے بہترین نمونۂ تغزل قرار دوں گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں اصلاح یا حذف و اضافہ کی گنجائش ہوئی تو یقیناً میرا ذوق پوری طرح آسودہ نہ ہوگا۔

اب میں آپ ہی کی خواہش کے مطابق کلام غالب سے چند مثالیں پیش کرکے اس کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مثالاً آپ غالب کی اولین غزل کو سامنے رکھئے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنی عالم تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

پہلا شعر جس حد تک صرف الفاظ کا تعلق ہے، قابل شکایت نہیں لیکن چونکہ خیال بہت بعید الفہم ہے، اسقدر بعید الفہم کہ خود غالب کا بیان کیا ہوا مطلب بھی اچٹا ہوا سا نظر آتا ہے، اس لئے یکسر تغزل سے علحدہ ہے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ نہایت سلجھا ہوا ہے اور اس میں کسی اصلاح کی گنجائش نہیں۔ شعر کا مفہوم بھی حدود تغزل میں آتا ہے، اور پہلا مصرعہ بھی غنیمت ہے۔ میں نے غنیمت اس لئے کہا کہ اس میں لفظ "کاوکاو" اچھا نہیں، اگر اس مفہوم کو لفظ کاوش سے ادا کیا جاتا جو کاوکاو کا مترادف ہے تو یہ نقص دور ہو جاتا۔ مثلاً یوں:-

کاوشیں اب سخت جانیہائے ہجراں کی نہ پوچھ

تیسرے شعر کے دونوں مصرعے علحدہ علحدہ اچھے ہیں، لیکن چونکہ دونوں کا تعلق بالکل لفظی رعایت اور مفروضہ باتوں پر منحصر ہے اس لئے شعر مہمل ہے۔ محض اس لئے کہ دم شمشیر، تلوار کی تیزی و آبداری کو کہتے ہیں اور لفظ دم سانس کے معنے میں بھی آتا ہے "سینۂ شمشیر" پیدا کرکے اس کا باہر ہونا دکھایا گیا ہے۔ علاوہ اس کے

کسی کے جذبۂ شوق کا اثر کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ تلوار اپنے آپ میں نہ رہے۔ الغرض یہ شعر بہ لحاظ تغزل بالکل قابل اعتنا نہیں۔ چوتھے شعر کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور ظاہر ہے کہ غزل سے اس خیال کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پانچویں شعر میں ایک ادعا ہے بغیر کسی ثبوت کے محض لفظ آتش کی رعایت سے حلقۂ زنجیر کو "موئے آتش دیدہ" کہا گیا ورنہ یوں بیتابی کے لحاظ سے جو "آتش زیرپا" ہونے کا صحیح مفہوم ہے، حلقۂ زنجیر قیامت تک "موئے آتش دیدہ" نہیں بن سکتا۔ الغرض مفہوم وبیان دونوں حیثیتوں سے یہ شعر تغزل سے خارج ہے۔

اب میں غالب کے چند اشعار ایسے پیش کرتا ہوں جو بہت مقبول ومشہور ہیں لیکن اس قسم کے نقایص سے خالی نہیں۔

کہیں نظر نہ لگے اُسکے دست وبازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

شعر بہ ظاہر نہایت مکمل معلوم ہوتا ہے اور ردو و غزلگوئی کے اندر بھی ہے، لیکن ایک غایر نگاہ انتقاد سمجھتی ہے کہ اس میں کیا نقص ہے۔ شعرا کے یہاں زخم وجراحت، خنجر وشمشیر کا ذکر صرف بہ سبیل مجاز وکنایہ ہوا کرتا ہے یعنی نہ تلوار سے مراد آہنی تلوار ہوتی ہے اور نہ زخم سے واقعی وہ زخم جو گوشت پوست کو متاثر کرتا ہے اسلئے اگر کوئی شاعر ان چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایسی چیز کو بھی شامل کر دے جو مجاز وکنایہ کو واقعہ وحقیقت میں بدلدے تو یہ شاعری کا نقص ہے۔ غالب دوسرے مصرعہ میں زخمِ جگر کے الفاظ لکھتا ہے جو ہمیشہ بہ صورت مجاز وکنایہ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ میں دست وبازو کی تعیین ہمیں مجبور کرتی ہے کہ زخمِ جگر کا مفہوم وہی لیں جو حقیقتًا ایک زخم کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے یہ شعر غزل کی لطافت سے بالکل علحدہ ہو کر فنون سپہ گری کی حد میں آگیا کہ تلوار سے حملہ کرنے کی وہ کونسی صورت ہو سکتی ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں جگر تک کاٹ کر جائے۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہوتا :-

نگاہِ ناز کو اسکے کہیں نظر نہ لگے

تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

مومن نے بھی اسی مضمون کو ایک شعر میں باندھا ہے لیکن حد درجہ لطافت کے ساتھ لکھتا ہے :-

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اس شعر کو صرف ایک لفظ غیر نے پایۂ تکمیل سے گرا دیا۔ کیونکہ غیر، در سے اُٹھا سکتا ہے آستان سے اُٹھا سکتا ہے، لیکن دیر وحرم سے اسے کیا تعلق۔ اس لئے اگر بجائے غیر کے لفظ کوئی استعمال ہوتا تو وہ

دیر و حرم پر بھی حاوی ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے لفظ کوئی کا اشارہ خود محبوب کی طرف ہوتا اور اس صورت میں شعر کا سوز و گداز زیادہ بڑھ جاتا۔

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس شعر میں صرف ایک لفظ تار نے جو نگاہ، اور نقاب دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے، غالب کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا، اور رعایت لفظی نے کوئی مفہوم پیدا ہونے نہ دیا ورنہ ظاہر ہے کہ تارِ نگہ کوئی مرئی و مادی چیز نہیں کہ نقاب کے اُبھرے ہوئے تار پر اس کا شبہ ہو سکے۔

یہ چند مثالیں میں نے ان اشعار سے لی ہیں جو عام طور پر بہت مشہور ہیں اور نہایت پاکیزہ سمجھے جاتے ہیں۔ ورنہ غالب کا وہ حصۂ کلام جو اس رنگ کا ہے۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

بالاتفاق یکسر تغزل سے خارج ہے۔ اسی طرح غالب کے بعض ایسے اشعار جو مفہوم کے لحاظ سے گھٹے ہوئے پست و رکیک ہیں۔ ان کا بھی ذکر فضول ہے۔

یہ تو ہوا غالب کی شاعری کا تاریک پہلو، لیکن اب روشن پہلو کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قیامت کا ہے۔ ایک اچھے شعر کی صفت یہ ہے کہ کسی حیثیت سے اس میں کسی ردو بدل کی گنجایش نہ ہو یعنی اگر آپ چاہیں کہ کوئی ایک لفظ بدلکر اس کی جگہ دوسرا رکھدیں تو ممکن نہ ہو۔ اس قسم کے اشعار غالب کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثالاً چند یہاں پیش کرتا ہوں۔

رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اس شعر میں الفاظ آزردہ، شوخ، تکلف، اندازِ جنوں اور ان سب کا محل استعمال اتنا دلکش ہے کہ نہ کوئی دوسرا لفظ ان کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے اور نہ اُن کی ترکیب کو بدلا جا سکتا ہے۔ پورا شعر سانچہ میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

بالکل یہی رنگ اس شعر کا بھی ہے۔ الفاظ کیا ہیں گویا نگینے جڑے ہوئے ہیں۔

۱ے مثلاً ــــ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس قسم کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :۔

واے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

بعض غزلیں پوری کی پوری اسی رنگ کی ہیں خصوصیت کے ساتھ وہ جو سہل زمین اور چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں۔

مجموعۂ استفسار وجواب جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب، تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے۔ اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ جبر و اختیار ــــ خواب کی حقیقت ــــ معاد و خلود ــــ طبقۂ نسوان اور غزلگوئی ــــ
برج بابل ــــ فاسسٹ جماعت ــــ سامری کون تھا ــــ باغ ارم کی حقیقت ــــ
فلسفۂ محبت ــــ بھوت پریت ــــ اصحاب کہف ــــ سالویشن آرمی
ہالہ کا سبب ــــ معجزہ و کرامات ــــ فرقۂ معتزلہ ــــ مذہب و عقل ــــ
طوفان نوح ــــ یاجوج و ماجوج ــــ برہمو سماج ــــ طبقۂ نسواں اور تعلیم ــــ
مریخ کی حقیقت ــــ منصور حلاج ــــ چند الفاظ کی تحقیق ــــ اصطلاحات تصوف کا ترجمہ ــــ

قیمت معہ محصول خریداران نگار سے ۲ روپیہ، غیر خریداران سے ۳ روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

عورت اور موجودہ آزادی

(جناب احمد کریم صاحب علیگ - ڈھاکہ)

آج جبکہ انسانی ترقیاں کمال کو پہونچ چکی ہیں۔ زندگی کا ہر مسئلہ نئے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کی موجودہ حالت بھی اسی سلسلہ میں زیر بحث رہتی ہے۔

اِس دور میں عورت کی آزادی اپنی جگہ پر مفید ہے یا غیر مفید اس سے بحث نہیں۔ اور نہ یہ کسی کے احتجاج یا منطقی دلائل سے رکنے والی چیز ہے۔ عورت آزاد ہوگی اور کامل آزاد۔

یہاں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی گفتگو کرنی نہیں ہے بلکہ خالص اخلاقی اور معاشرتی پہلو سے ہندوستانی عورتیں ابھی آزادی کے اُس درجہ کو نہیں پہونچی ہیں جہاں مغربی عورتیں پہونچ چکی ہیں۔ لیکن موجودہ رفتار آزادی سے ظاہر ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہاں بھی وہی صورت ہوگی جو آج یورپ کی ہے۔

ممکن ہے کوئی صورت ایسی نکل آئے (جس کی کوئی اُمید نہیں) جو یورپ کی طرح آزاد ہونے سے روک دے۔ کاش یہ نہ ہوا تو اُسوقت یہاں کے اخلاق کا معیار کیا ہوگا؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کمل آزادی کا آخری نتیجہ "عصمت ریزی" ہے اور پھر جب عورت کا شیوہ یہ ہو جائے کہ وہ مرد کے جذبات کو ٹھکرا دے اُس وقت معاشرتی اور خانگی زندگی کا کیا حشر ہونا ہے؟

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب عورت اپنے جایز حقوق سے آگاہ نہ تھی اور جہالت کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہی تھی اُسوقت مرد کا سلوک بھی اُس کے ساتھ یہی تھا۔ قدرت نے اب عورت کو اس سلوک کا

انتقام لینے کا موقع دیا ہے لیکن یہ انتقام کا جذبہ خانگی زندگی کی خوشگواریوں کو اور بھی مکدر کر دے گا کیونکہ مرد کا سلوک انتقامی جذبہ کے ماتحت نہیں تھا بلکہ اپنی خواہشات کے ماتحت۔ لیکن جب عورت ہر قدم پر مرد کو اُس کی گزشتہ بے عنوانیوں کے سبب ذلیل کرنے کی انتہائی کوشش کرے گی اُس وقت سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی؟۔

ہندوستان کس رنگ میں رنگے گا اس کا قطعی فیصلہ ابھی کر لینا ایک گونہ محال ہے لیکن مغرب پر کیا گزر رہی ہے؟ وہاں کی عورتیں کامل آزادی حاصل کر چکی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک عصمت کا مفہوم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ پھر وہاں خانگی زندگی کوئی چیز نہیں۔ اگر ہے بھی تو ایسی کہ آئے دن ناخوشگوار بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔

انسان جس سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے۔ جس ماحول میں بڑھتا ہے اور جو فضا اُس کے سامنے ہوتی ہو اسی کے زیر اثر رہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب میں عورتوں کی آزادی کے سبب جو باتیں پیدا ہو گئی ہیں وہ سوسائٹی کے لئے اب ضروری سمجھی جا رہی ہیں اور اس کے تاریک پہلو کو وہاں بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ اس کی کوئی اہمیت ہے۔

تو کیا موجودہ ترقیوں کا یہی نتیجہ ہے؟۔

پھر یہ کہنا کہ "موجودہ تہذیب نام ہے نفرت۔ دہریت۔ خود غرضی اور آوارگی کا" غلط تو نہ ہوگا؟۔

(نگار) یہ بالکل درست ہے کہ ہندوستان کی عورت کی آزادی کا مسئلہ اب "کاش" اور "مبادا" کے حدود سے گزر کر "کُن فیکون" کے منازل سے گزر رہا ہے اور اس لئے اب سوال اس کے رواج و انسداد پر غور کرنے کا نہیں ہے بلکہ انتظار نتیجہ کا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے تحفظ یا عورت کے ساتھ نباہ کرنے کا۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے ملک کی عورتوں میں آزادی کا جذبہ براہ راست خود ملکی ترقی یا قوم کے ذہنی عروج کا نتیجہ لازم نہیں ہے بلکہ وہ پیدا ہوا ہے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت سے اور ظاہر ہے کہ جس ترقی یا آزادی کی ابتدا ایک خاص اصول کے ماتحت ہوگی، اس کا انجام بھی اسی کے زیر اثر مترتب ہوگا۔

لہٰذا اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ مغرب کی عورت کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اور اُسے کیوں بُرا سمجھا جائے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مغرب کی عورت اس وقت ترقی و آزادی کے ایسے پُر ہیجان دور سے گزر رہی ہے کہ اُسے خود بھی نہیں معلوم اس کا نصب العین کیا ہے۔ تاہم کسی نہ کسی منزل تک پہونچکر ٹھہرنا اس کو ضرور ہے اور اسی کے مالہ و علیہ پر غور کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔

مغربی عورت کی ذہنی آزادی کی تاریخ اس میں شک نہیں اب سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے لیکن عملاً آزاد ہونے کا سب سے پہلا موقعہ اُسے گزشتہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں ہاتھ آیا اور چونکہ اس نے اپنی اس اہلیت کو بڑی حد تک مرد سے تسلیم بھی کرالیا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ پوری طرح نہ کھُل کھیلتی اور حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی لذت ہی ایسی قیامت کی لذت ہے کہ ایکبار اس سے آشنا ہونے کے بعد اس کو ہاتھ سے دیدینا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

پھر جنگ کے بعد جس تیزی سے اس نے عملی دنیا میں قدم اُٹھایا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج کونسا شعبۂ حیات ایسا ہے جس پر عورت قابض ہونا نہیں چاہتی اور مرد سے بے نیاز رہنے کی کونسی صورت ایسی ہے جو اس کے پیش نظر نہیں، یہاں تک کہ مرد کا احسان لئے بغیر بچہ جننا بھی اسے منظور ہے (اگر واقعی اس تیغ و تفنگ والی ہلاکت آفریں فضا میں بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کا سوال کبھی اسکے سامنے آسکتا ہے)۔

عورت کی خواہش یہ ہو یا کچھ اور، لیکن اس کا کھُلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ نظام تمدن کے ہر شعبہ میں اسکی نیابت کو تسلیم کرنا پڑے گا اور جس طرح پہلے عورت کو مرد کی ہر خواہش کے سامنے سر عجز جھکا دینا پڑتا تھا اسی طرح اب مرد کو اس کے مطالبات کے حضور میں گردن خم کرنا پڑے گی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دنیا معاشرت و اخلاق کے قانون میں ایسا ردوبدل کرنے پر مجبور ہوگی کہ بہت سے ایسے "نوشش" جو اس سے قبل عورت کے لئے ممنوع تھے اب جایز قرار دئے جائیں اور بہت سے ایسے "نیش" جن سے مرد محفوظ رہتا تھا اب اسے گوارا کرنا پڑیں۔ بہر حال مغربی عورت کی آزادی خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، مرد کو پسند آئے یا نہ آئے ایک واقعہ کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اگر ہندوستانی عورت بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلی (جیسا کہ بظاہر نظر آرہا ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی آخر کار مرد کیلئے (آپکے نقطۂ نظر سے) "بلائے جاں" نہ ثابت ہو (اگر اسکا "بلائے جاں" ہونا واقعی کوئی "بلا" ہے)۔

آپنے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ عورت کی آزادی کا لازمی نتیجہ سوائے "عصمت ریزی" کے اور کچھ نہیں اور آپ کے نزدیک یہی ایک سب سے بڑی وجہ معاشرتی و خانگی زندگی کو تباہ کرنے کی ہے، مجھے ان دونوں سے اختلاف ہے، یعنی اول تو میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ عورت کی آزادی کا لازمی نتیجہ "عصمت ریزی" قرار پائے اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو بھی نظام معاشرت و تمدن کی برہمی کا سبب اس کو قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ عصمت و حفاظتِ عصمت کے جس قانون سے عورت کو جکڑا گیا ہے، اصولاً مرد بھی اسی کا پابند ہے، یعنی اگر عورت کی "عصمت ریزی" کوئی بُری چیز ہے تو مرد کی "عصمت ریزی" بھی اس سے کم مکروہ نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرد نے اپنے لئے کبھی اس کی پابندی کو اتنا ضروری نہیں سمجھا اور نظام معاشرت و تمدن جوں کا توں قایم رہا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس باب میں عورت کی پابندی کوئی اور نتیجہ پیدا کرے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت و مرد کے خدمات و فرایض، اور ان دونوں کی فطرت میں بڑا فرق ہے اس لئے مرد کی بے عصمتی اتنی ضرر رساں نہیں جتنی عورت کی، لیکن اس دلیل میں بڑا زبردست مغالطہ پایا جاتا ہے کیونکہ مرد کی بے عصمتی متلزم ہے کسی نہ کسی عورت کی عصمت ریزی کو اور اگر عورت کی عصمت ریزی معاشری زندگی کو برباد کرنے والی ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ مرد بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اس باب میں مرد و عورت کے درمیان بہت فرق ہے مرد کی ایک ایسی مستبدانہ دلیل ہے جو اس دور آزادی میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

اس لئے عورت کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی عصمت کا سوال اتنا ہی غیر اہم ہے جتنا مرد کی عصمت کا اور اصل خطرہ کی جستجو ہم کو کسی اور جگہ کرنا چاہئے اگر واقعی عورتوں کی آزادی میں کوئی خطرہ پنہاں ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے یوروپ کی تاریخ ترقی کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ وہاں جس چیز کو ترقی و تنزل سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ یکسر مادی نفع و ضرر سے متعلق ہے۔ صنعت و تجارت، اخلاق و سیاست، علوم و فنون الغرض ہر ذہنی اکتساب اپنے نتیجہ کے لحاظ سے کسب دولت کے حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور اس لئے وہاں عورت کی آزادی کا بھی صرف یہی مفہوم ہے کہ وہ مرد کے برابر تگ و دو کرے اس کے برابر کمائے اور اس کے دوش بدوش زندگی کے تمام کاموں میں دلچسپی لے۔ پھر اگر روحانیات یا اخلاق کو نظر انداز کر دیجئے (جس کا مشرق اتنا دلدادہ نظر آتا ہے اور جس کا حقیقتاً کوئی مفہوم اس دنیا میں متعین نہیں ہو سکتا) تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ عورت کی یہ خواہش کیوں مذموم سمجھی جائے اور اگر وہ دنیائے سعی و عمل میں مرد سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے تو اسے کیوں قابل الزام ٹھہرایا جائے۔

میں نے دیکھا ہے کہ اکثر حضرات اس گفتگو کے سلسلہ میں مغربی عورت کے اخلاق اور اس کی طرف سے مرد کی بیزاری کو ضرور بطور دلیل پیش کرتے ہیں، درانحالیکہ حقیقتاً نہ وہاں کا مرد اپنی عورتوں سے بیزار ہے اور نہ وہاں کی عورتیں محض آزادی کی وجہ سے اتنی زیادہ بداخلاق ہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اگر ہوں بھی تو اس کا سبب محض آزادی کو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ غیر آزاد ملکوں کی غیر آزاد عورتوں میں بھی اس نوع کی کمزوریاں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھنے کے عادی ہیں اور غیر عورتوں سے نہ آزادی مل سکتے ہیں، نہ بے پردہ انھیں دیکھ سکتے ہیں، عورت کے باب میں حد درجہ حریص و بیتاب واقع ہوتے ہیں اور ان کا یہ "ندیدا پن" نفسیاتی طور پر ہر عورت کو بُری نگاہ سے دیکھنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس لئے جس وقت وہ آزاد عورتوں کو مردوں کے ساتھ ہنستے بولتے، چلتے پھرتے دیکھتے ہیں تو وہ ان مردوں کی جگہ اپنے آپ کو رکھ کر اپنے بیکسانہ شوق کے اضطراب کے لحاظ سے حکم لگاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ

مرد و عورت کا باہم ملنا اور پاکباز رہنا بیک وقت کیونکر ممکن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر پردہ نشین عورت پاکباز نہیں ہے اسی طرح ہر آزاد عورت بداخلاق نہیں، اور محض آزادی و بےپردگی کو "عصمت ریزی" کا سبب قرار دینا نادرست ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یوروپ کی خانگی زندگی بہ نسبت مشرق کے صرف اسی آزادی کی وجہ سے تباہ ہے اور اس کے ثبوت میں طلاق کی کثرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ میں اس کے ماننے کے لئے بھی طیار نہیں، کیونکہ جس طرح مغرب میں اہلی زندگی کی ناخوشگواری کی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی نظر آتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں اس بلا کو برابر اپنے اوپر مسلط رکھتے ہیں اور وہاں اس سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگر آج ہندوستان میں بھی خلع و طلاق کی آسانیاں وسیع ہو جائیں اور یہاں کی عورت بھی اپنی معاش کی خود کفیل ہونے کی اہلیت حاصل کر لے تو یہاں یوروپ سے زیادہ اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اگر جستجو کی جائے تو ہندوستان میں اس وقت پچاس فی صدی سے زیادہ ایسے گھرانے ہوں گے جو زن و شو کے مزاجی اختلاف کی وجہ سے جہنم کا نمونہ بنے ہوئے ہیں، لیکن چونکہ مرد رسم و رواج کی بنا پر عورت کو طلاق دینا غیرت کے خلاف سمجھتا ہے اور عورت بھی طلاق حاصل کرنے کے بعد اپنی معاش کی خود کفیل نہیں ہو سکتی اس لئے دونوں اپنی اپنی جگہ خاموشی سے اس سوہان روح کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور خلع و طلاق کی نوبت نہیں آتی۔

الغرض عورت کی موجودہ تعلیم و آزادی کی مخالفت صرف اس لئے کرنا کہ وہ مستلزم ہے عصمت ریزی کو یا یہ کہ وہ اہلی زندگی کو ناخوشگوار بنا دینے والی ہے۔ میرے نزدیک کسی طرح درست نہیں لیکن جیسا کہ میں نے ابتدائی سطروں میں بیان کیا ہے یہ مسئلہ ضرور قابل توجہ ہے کہ چونکہ یہاں کی عورت کی آزادی خود ملکی ترقی یا قومی آزادی کا نتیجہ نہیں بلکہ تقلید ہے مغربی اقوام کی، اس لئے نہ اس پر ہم کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ حقیقتاً ہماری تہذیب و معاشرت اس کو گوارا کر سکتی ہے۔

مشرق و مغرب کا جغرافی اقتضا طبیعی ماحول تاریخی و روایتی نظام تمدن، مذہبی احساس اور اخلاقی نشو و نما بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لئے یہاں کی عورت کا وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنا جسے یہاں سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں اور اس کا مغرب کے نقش قدم پر چل پڑنا کبھی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

جس حد تک نفس آزادی اور نفس تعلیم کا تعلق ہے، اس کی مخالفت حماقت ہے لیکن آزادی و تعلیم کی نوعیت ضرور بحث طلب امر ہے۔

اس وقت لڑکیوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جس نہج سے ہو رہی ہے وہ یقیناً مضرت رساں ہے۔ تعلیم کا سب سے پہلا مقصود یہ ہے کہ انسان میں جذبۂ خود اعتمادی اور احساس قومیت و

پاس عزت پیدا ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انگریزی تعلیم ان میں بجائے خود اعتمادی کے خود فروشی، بجائے احساسِ قومیت کے، انفرادی خود غرضی اور بجائے پاسِ عزت و خودداری کی جگہ ہلکاپن پیدا کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصود صرف چہرہ کا غازہ، ملبوس کا حُسن اور زیبائش ظاہری ہے احساس کی سنجیدگی، جذبات کی گہرائی، اور اجتماعی ہمدردی کوئی چیز نہیں ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ لڑکیوں کی تمام تعلیم ایک غیر زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور وہ بھی حد درجہ ناقص و نامکمل اس لئے قدرتاً وہ انگریزی معاشرت کی طرف مایل ہوجاتی ہیں اور انھیں یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انگریزی بولیں اس حال میں کہ پاؤں میں شلوار ہو اور سر پر دوپٹہ۔ یورپ اور ہندوستان کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے وہاں کی فضا میں جو پیدا ہوتا ہے آزاد پیدا ہوتا ہے اور وطنی محبت، اور قومی خودداری کے آغوش میں اس کی پرورش ہوتی ہے، اس لئے اگر وہاں کی عورتیں نمائش ظاہری پر جان دیتی ہیں تو ساتھ ہی ساتھ وہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے بھی ہر وقت سربکف نظر آتی ہیں، برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں مردوں میں بھی یہ جذبہ نہیں پایا جاتا، چہ جائیکہ عورتیں جن کی تعلیم مردوں سے زیادہ ناقص و نامکمل ہے۔

الغرض عورتوں کی بیجا آزادی ہو یا مردوں کی گمراہی سب غلط تعلیم کا نتیجہ ہے اور جب تک کسی قوم کا نظام تعلیم خود اس کے ہاتھ میں نہ ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آپ عورتوں کے حال پر سر دھن رہے ہیں حالانکہ سب سے پہلے آپ کو مردوں کے اخلاق کا ماتم کرنا چاہئے اور قبل اس کے کہ آپ اپنی لڑکیوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں، اپنے لڑکوں کو دیکھئے کہ اُن کا کیا حال ہے۔ آپ کو اس کی فکر تو بہت ہے کہ عورتیں مرد ہوتی جارہی ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کہ مرد، عورت بنے جا رہے ہیں۔

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

اُردو زبان میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے، اگر آپ "گناہ کی دنیا" کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو اس تصنیف کو ملاحظہ فرمایئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہے۔ فحاشی کی تمام صورتیں اور اُن کی مفصل تاریخ عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک مع ان سیکڑوں عجیب و غریب واقعات کے جن کی طرف یوں کبھی آپ کا ذہن بھی نہ منتقل ہوا ہوگا، اس کتاب میں موجود ہیں۔ الغرض یہ کتاب "جنسیات" کے موضوع پر ایک سائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور ممکن نہیں کہ آپ ایکبار اس کو شروع کرنے کے بعد آخر تک دیکھنے پر مجبور نہ ہوں۔ قیمت غیر مجلد تین روپیہ، مجلد ؎ علاوہ محصول۔ خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت۔

منیجر نگار - لکھنؤ

چاند کا سفر

فضائے بسیط کا سب سے زیادہ دلکش اور قریب تر سیارہ جو ہماری نگاہوں اور ہمارے خیالوں کو روز اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے، چاند ہے۔ بچے دیکھتے ہیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، عورتیں اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اپنے جگر گوشوں سے "چندا ماموں" کہلاکر اس کو اپنا بھائی بنانے میں خاص مسرت محسوس کرتی ہیں، بڑی بوڑھیاں دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انھیں کے سن و سال کی کوئی عورت بیٹھی ہوئی چرخا کات رہی ہے اور سوختہ دل عشاق کا تو ذکر ہی کیا کہ ہجر و وصال دونوں کی کیفیتیں بہت کچھ اس سے وابستہ ہیں۔ لیکن اب جدید دنیا کے جدید علوم و فنون جنھوں نے خیالی دنیا کی بہت سی لذتوں کو غارت و برباد کیا ہے، ہماری اس لذت کو بھی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہ چاند تک پہونچ جائیں اور ہمیں یہ خبر سنائیں کہ یہاں تو ویرانی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اگر ہم علوم جدیدہ کے تمام کارناموں پر نظر ڈالیں تو چاند تک پہونچنا کیسا وہ اگر تارے توڑ لانے کا دعویٰ کریں تو بھی ان کو نہیں جھٹلا سکتے، کیونکہ پندرہ ہزار مٹر کی بلندی تک تو عہد حاضر کا انسان پہونچ ہی گیا ہے اور "ہوائیوں" کے اختراع نے انسانی پرواز کی طاقت کو کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ چاند تک پہونچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ آیئے علمی نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ پر نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ اس سفر میں انسان کو کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اگر انسان نے کسی وقت سیاروں کی طرف اپنے سفر کی ابتدا کی تو ظاہر ہے کہ اس کا سب سے پہلا اسٹیشن چاند ہوگا کیونکہ وہی ہم سے قریب تر واقع ہے۔ (یعنی ۲۴۰۰۰۰ میل) اور زمین کی جاذبیت اسے اپنا تابع بنائے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چاند کے سفر میں صرف اسی حد تک دشواریاں پیش آئیں گی، جس حد تک ہوا کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ فضا میں یہی ایک چیز حرکت کا مقابلہ کرنے والی ہے لیکن جب ہوا کے حلقہ سے باہر ہو گئے تو پھر جوں جوں زمین سے دور ہوں گے، اس کی قوت کشش ضعیف ہوتی جائے گی اور چاند کی کشش ہماری رفتار کو اور زیادہ تیز کر دے گی۔ ہوا کا حرکت کے مزاحم ہونا شہاب ثاقب سے بخوبی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں دفعۃً روشنی نمودار ہوئی

اور دور تک ایک لکیر بناتی ہوئی غائب ہوگئی - اس کو ہم اپنی اصطلاح میں ستارے ٹوٹنا کہتے ہیں - آپ کو معلوم ہے یہ کیا ہے - یہ حقیقتاً اجرام سماوی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے فضا میں نہایت سرعت کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہے ہیں لیکن جب وہ کرۂ ارض کے قریب آتے ہیں تو ہوا کے تصادم سے مشتعل ہو کر گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں - الغرض ہوا کا غلاف جس طرح فضا کی دوسری چیزوں کو زمین تک پہونچنے سے باز رکھتا ہے، اسی طرح زمین والوں کو بھی فضائے بسیط میں بہت زیادہ سرعت کے ساتھ پرواز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لئے اگر انسان ہوا کے حلقہ سے باہر نکل جائے تو پھر اس کے لئے آگے بڑھنے میں واقعی بہت سی آسانیاں ہیں -

بظاہر یہ امر زیادہ مشکل نہیں کہ چاند تک پہونچنے کے لئے ایک غبارہ طیار کر لیا جائے لیکن اس میں ایسی زبردست قوتِ دافعہ پیدا کرنا کہ وہ برابر کام کرتی جائے دشوار ہے کیونکہ جس طرح سمندر کی تہ تک پہونچنے کے لئے پانی کا دباؤ مانع آتا ہے، اسی طرح فضائے بسیط میں پہونچنے کے بعد ہوا کے دباؤ کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے - علاوہ اس کے ایک دشواری اور یہ پیدا ہوگی کہ غبارہ کا وہ حصہ جو سورج کی طرف رہیگا اس میں تو گرمی اتنی پیدا ہو جائے گی کہ آپ انڈا اُبال لیجئے لیکن دوسری جانب درجۂ حرارت صفر سے بھی ۴۵۹ درجے نیچے گرا ہوا ہوگا اور اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ اسبٹاس (Asbestos) کے ذریعۂ حرارت کو ناقابل نفوذ بنایا جائے اور دورۂ حرارت کا توازن دونوں جانب یکساں رہے -

چاند کے مسافر کو عادتاً کھانے پینے کی بھی ضرورت ہوگی، سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی کافی مقدار درکار ہوگی - پھر سوال یہ ہے کہ سانس سے جو کاربن نکلے گا وہ کہاں جائے گا، ظاہر ہے کہ غبارے کے باہر تو جا نہ سکے گا (کیونکہ وہ تو چاروں طرف سے بالکل بند ہے) اس لئے کوئی اور طریقہ کیمیاوی تحلیل کا اختیار کرنا پڑے گا اور ان تمام باتوں کا اہتمام آسان نہیں - اسی کے ساتھ اب اور دشواریوں کو لیجئے جو علمی نقطۂ نظر سے پیش آنے والی ہیں - دنیا میں جس چیز کو ہم وزن سے تعبیر کرتے ہیں وہ نام ہے صرف کشش زمین کا، ہمارا چلنا پھرنا، ایک جگہ سیدھا کھڑا ہو جانا یہ سب جاذبیت ارض کے طفیل میں ہے اس لئے جس وقت غبارہ کشش زمین کی حد سے علٰحدہ ہو جائے گا تو اس کے اندر انسان کا وزن گھٹ کر دھوئیں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم ہو جائیگا اور غبارہ کے اندر سطح پر چلنے سے معذور ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ فوراً گر پڑے گا، یہاں تک کہ چھینک اور کھانسی کی حرکت سے بھی اس کے قدم اُکھڑ جائیں گے اور وہ غبارہ کے اندر بجائے چلنے کے بالکل دھوئیں کی طرح تیرتا ہوا اور اڑتا ہوا نظر آئے گا - اب خورونوش کے انداز کو دیکھئے کہ کیا ہوگا - کھانا تو خیر کسی طرح کھا لیا جائے گا، لیکن پانی پینے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ گلاس یا صراحی سے پانی انڈیلنا ناممکن ہوگا اور پانی

کے قطروں کو اُنگلی سے سرکا کر منھ تک لانا پڑے گا یا کسی نلکی کے ذریعہ چوسنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے پانی اگر منھ تک پہونچ گیا تو وہ خود حلق کے اندر اُترے گا نہیں جب تک عضلات کی جدوجہد سے کام نہ لیا جائے۔ یہی دشواری نیند میں بھی ہوگی کیونکہ زوال جاذبیت کی وجہ سے خون کا دورہ صرف دماغ کی طرف رہیگا اور خواب سے جو راحت حاصل ہوتی ہے وہ میسر نہ آئے گی۔

البتہ جب جاذبیت زمین کے حدود سے گزر کر کرۂ قمر کے حدود کشش میں غبارہ پہونچے گا تو یہ کیفیت بڑی حد تک دور ہو جائے گی لیکن اصلی حالت پھر بھی پیدا نہ ہو سکے گی، کیونکہ چاند کی کشش بہ نسبت زمین کے کم ہے اور اس لئے ہر چیز کا وزن ہلکا رہیگا۔

اس کے بعد جب غبارہ چاند کے قریب پہونچے گا تو یہ کشش بڑھتی جائے گی اور اسوقت ضرورت ہوگی کہ غبارہ کو آہستہ آہستہ اُتارنے کے لئے مخالف سمت میں ہوائیاں سر کر کے اس کشش کا مقابلہ کیا جائے جو آسان کام نہیں۔ اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہو بھی گئی تو جسوقت غبارہ سطح قمر پر اُترے گا تو سب سے بڑا اہم سوال اس سے باہر نکلنے کا ہوگا کیونکہ جس وقت دروازہ کھلیگا تو اس ہوا کی قوت سے جو غبارہ کے اندر ہے ہر شخص اور غبارہ کے اندر رکھی ہوئی ہر چیز گولی کی طرح باہر نکلے گی اس لئے ظاہر ہے کہ پہلے کسی چھوٹے سوراخ کے ذریعہ سے اس ہوا کو نکالنا پڑے گا اور کوئی ایسا معدنی ملبوس استعمال کرنا ہوگا جیسا پانی میں غوطہ لگاتے وقت استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے معمولی لباس کا استعمال کرنا دشوار ہوگا۔

اب ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جس وقت انسان سطح قمر پر قدم رکھے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس باریک غبار سے بالکل اٹ جائے جو لکھوکھا سال سے بغیر بارش اور ہوا کے وہاں پایا جاتا ہے اور وہاں کی سطح کرۂ ارض کے سطح کی طرح سخت و جامد نہ ہو، یا پھر یہ کہ وہاں کی سطح کانچ کی طرح ٹوٹ جانے والی ہو اور اس پر چلنا دشوار ہو۔

اسی کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ حرارت و برودت کا ہے جس سے انسان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ چاند کا وہ حصہ جو آفتاب کی طرف ہے وہ آگ کی طرح گرم ہوگا اور مخالف سمت میں حرارت صفر سے بھی ۲۹۵ درجے کم پائی جائے گی۔ اس لئے انسانی زندگی کے لئے دونوں سمت موافق نہیں۔

کھانا پکانے یا اپنے آپ کو گرم کرنے کے لئے آگ روشن کرنے کی بھی ضرورت ہوگی لیکن چاند میں اس کا امکان نہیں، کیونکہ اول تو وہاں ایندھن کہاں اور اگر ہو بھی، تو ہوا اور آکسیجن کیونکر میسر آئیں کہ جن کے بغیر آگ مشتعل نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑی زحمت اور یہ ہوگی کہ اگر کھانا کسی طرح پکا لیا گیا تو اس کے کھانے کی کوئی تدبیر نہیں کیونکہ ظرف کا منھ کھولکر منھ کے اندر نوالہ رکھتے ہی ایسی تیز ہوا پیدا ہوگی کہ آنکھیں باہر نکل آئیں گی

ناک کان پھٹ کر خون بہنے لگے گا اور انسان فوراً مر جائے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ سطح قمر پر ہوا برف کی طرح منجمد ہے۔ اور اس لئے اس منجمد برف کو غبارہ کے اندر رکھنے سے وہ آہستہ آہستہ گیس میں تبدیل ہو جائے گی اور انسان اس سے کام لے سکیگا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ آفتاب کی طرف جو حصہ چاند کا رہیگا وہاں ہوا کے منجمد ہونے کا کوئی امکان نہیں اور گردش کے سلسلہ میں چاند کے دونوں سمت کا یکے بعد دیگرے آفتاب کی حرارت سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

چاند میں چونکہ کسی ذیحیات کا وجود نہیں ہے اس لئے درندے اور جراثیم بھی وہاں نہ ہوں گے اور اس لحاظ سے انسان وہاں محفوظ ہے لیکن درندوں سے زیادہ خطرناک وہاں کے شہاب ثاقب اور چٹانیں ہیں جو اکثر گرتی رہتی ہیں اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ کوئی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی اس لئے اس خطرہ کی اطلاع بھی پہلے سے ہونا ممکن نہیں۔

چاند کے سیاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ ایک گاڑی کے تمام اجزاء لیجائے تاکہ انھیں جوڑ کر ایک گاڑی طیار کر سکے جس کی ہوا باہر نہ نکلے اور ایسی قوت سے اسے چلائے جس کے لئے ہوا کی ضرورت نہ ہو۔

آخر میں سوال وہاں سے واپس آنے کا پیدا ہوتا ہے، لیکن اس سوال پر وہاں پہونچنے سے قبل کوئی گفتگو کرنا بیکار ہے۔ الغرض چاند کا سفر ایسا آسان نہیں ہے اور وہ لوگ جو "چاند کی بڑھیا" کے سکون میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے انھیں مطمئن رہنا چاہئے کہ علوم و فنون کی دنیا میں اکثر حضرات خواب بھی دیکھا کرتے ہیں اور یہ تمام باتیں اسی خواب کی ہیں۔

جمالستان

حضرت نیاز کے اُن ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ جو انشاء عالیہ کی جان ہیں — ادب اُردو میں جو خصوصیت حضرت نیاز کی طرز نگارش کو حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ۵۰۵ صفحات کے مجموعہ کا ہر ہر لفظ اپنی جگہ ایک ایسی دلکش حقیقت کا مالک ہے جو صرف مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔

قیمت فی جلد خریداران نگار سے تین روپیہ اور غیر خریداران نگار سے چار روپیہ علاوہ محصول۔

منیجر نگار - لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

نجم السحر | انگریزی ناول نویسوں میں رائڈر ہیگرڈ خاص شہرت کا مالک ہے اور مصر قدیم کے متعلق تو اسکے فسانوں نے غیر معمولی درجۂ قبول حاصل کیا ہے۔ اسی کا ایک ناول ہے جس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے نجم السحر کے نام سے کیا ہے (صبح کا ستارہ شاید اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ اس نام کا ایک جرمن خضاب موجود ہے اور ستارۂ سحری اس لئے نہیں کہ یہ بالکل عجمی ترکیب ہے اور مصریات کی پُرہیبت داستانوں کی رعایت کے لحاظ سے اس میں وہ ثقل نہیں پایا جاتا جو نجم السحر میں ہے)

مولوی عنایت اللہ صاحب عرصہ تک دارالترجمہ حیدر آباد کے ناظم رہ چکے ہیں اور انگریزی کتابوں کے ترجمہ میں مہارت خصوصی رکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حتی الامکان اصل کتاب کا کوئی لفظ ترک نہیں ہوتا اور باوصف اس پابندی کے بہت صاف و شگفتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی یہی خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے اور اگر ان اُلجھنوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو خود رائڈر ہیگرڈ کے شکل و دقیق انداز تحریر میں پائی جاتی ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کو ترجمہ کی حیثیت حاصل ہے۔

اس فسانہ میں مصر قدیم کی نہ صرف تہذیب و معاشرت اور مذہبی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے بلکہ اس عہد کی سحر کاریوں کو بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قم و جادہ کی داستان طلسم ہوشربا سامنے آجاتی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ ہے اور عمر میں ساقی بک ڈپو دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر | منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے نیشنر ڈپٹی کلکٹر کی تصنیف ہے جو سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی اور ان کی شاعری سے بحث کرتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر اس لحاظ سے کہ وہ مغل فرمانرواؤں میں سب سے آخری فرمانروا تھا، عہد مغلیہ کی تاریخ میں بالکل مقطع الکلام کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے بہت زیادہ توجہ کا مستحق تھا، لیکن اسوقت تک کوئی کتاب مخصوص اس موضوع پر اردو میں ایسی نہیں لکھی گئی تھی جو تاریخی و ادبی دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہو۔ اس کتاب میں نہ صرف ظفر کی ولادت سے لیکر ان کی وفات تک کے تمام حوادث سیاسی پر ناقدانہ د

محققانہ نظر ڈالی گئی ہے بلکہ بہادر شاہ ظفر کی محلی زندگی اور اس وقت کی معاشرت کو بھی نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ آخری حصہ ظفر کی شاعری کے لئے وقف ہے اور اس پر حد درجہ لطیف تبصرہ کیا گیا ہے۔ الغرض تاریخی و تنقیدی حیثیت سے یہ کتاب اسوقت کی بہترین تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اگر ہم اس تصنیف کی زبان و انشار اور اس کی ادبی خوبیوں کو سامنے رکھیں تو ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ اردو زبان میں شاید ہی اسوقت تک دو چار کتابیں ایسی شایع ہوئی ہوں جن میں تاریخ ایسے خشک بحث کو محض زور انشار سے اتنا دلچسپ بنادیا گیا ہو۔

منشی امیر احمد صاحب علوی، متعدد تاریخی تصانیف کے مصنف ہیں اور ان کے انداز تحریر کی یہ دلکش خصوصیت سب میں پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ ظفر کے حالات خود بہت دلدوز ہیں، اس لئے منشی صاحب کی تحریر کی اثر آفرینی بھی اس میں اپنی انتہائی درجہ کو پہونچ گئی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس کی پہلی سطر پڑھنے کے بعد آخری سطر تک پہونچنے پر مجبور نہ ہو۔

ناظرین نگار میں سے بعض حضرات اب بھی نگار کے ظفر نمبر کی جستجو میں ہیں اس لئے ان کو خوش ہونا چاہئے کہ اس ظفر نمبر سے بہتر ایک چیز ان کے سامنے موجود ہے اور امیر محل لائبریری، کاکوری لکھنؤ سے ۸؎ میں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

سحر بنگال مجموعہ ہے جناب طاہرہ دیوی شیرازی کے ان چند افسانوں کا جو اسوقت تک مختلف رسایل و جرائد میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین افسانے تو وہ ہیں جو نگار میں شایع ہوئے ہیں اور باقی وہ جو ساقی اور ہمایوں وغیرہ کے لئے باعث زینت ہوئے۔

طاہرہ دیوی شیرازی اپنے نام کی اس عجیب و غریب ترکیب کے لحاظ سے کیا ہیں، اس کا ذکر میں نگار میں ایک بار کر چکا ہوں اور بہ حیثیت ادیب ہونے کے ان کا کیا مرتبہ ہے۔ اس پر بھی اپنی رائے اُن کے ایک افسانہ (سکون کی جستجو) کو شایع کرتے ہوئے میں نے ظاہر کر دی تھی۔ چونکہ طاہرہ دیوی نے سرزمین بنگال کی فسانہ خیز فضا میں پرورش پائی ہے اس لئے یوں بھی انھیں ایک اچھا فسانہ نگار ہونا چاہئے تھا، لیکن خوش قسمتی سے انھیں فرانسیسی و فارسی ادبیات کے مطالعہ کا موقعہ بھی مل گیا اس لئے ان کے اس ذوق میں اور زیادہ لطافت و پاکیزگی پیدا ہو گئی ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے میرے نام سے منسوب کیا ہے یعنی عمر میں بالکل پہلی مرتبہ مجھ کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ "بلبل" کا ہم قافیہ "گل" ہونا واقعی کوئی قابل فخر امر ہے یا قابل رحم ــــ

اس مجموعہ میں مصنفہ کی تصویر بھی شامل ہے اور میری بھی لیکن دونوں میں پورے چھ صفحات کی دیوار حایل ہے۔ یہ کتاب بھی ساقی بک ڈپو کے منشورات ادب میں سے ہے اور نفیس کتابت و طباعت

کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے - قیمت عہ ہے -

آہنگ رزم مجموعہ ہے جناب وقار انبالوی کی چودہ رزمیہ نظموں کا - رزمیہ نظموں کے لئے الفاظ وخیالات دونوں خاص ہوا کرتے ہیں اور جب تک ان میں توافق نہ ہو، کامیابی مشکل ہے -

اس مجموعہ میں اکثر نظمیں ایسی ہیں جو اس توافق سے خالی ہیں اور بعض میں اگر یہ ہم آہنگی پائی بھی جاتی ہے تو اس قدر ضعیف کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - جذبات حماست آورد کی چیز نہیں ہے بلکہ پیدا ہوتے ہیں دل کے اس جوش سے جو انسان کو سرفروشی پر آمادہ کر دیتا ہے - اس لئے اگر ہندا ور اہل ہند کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم وقار صاحب کی نظموں میں اس جوش کا فقدان محسوس کرتے ہیں تو موردِ الزام وہ نہیں ہیں بلکہ ساری قوم ہے جو اس جذبہ کو عرصہ ہوا کھو چکی ہے -

اس سے قطع نظر، محض ادبی، شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے البتہ اس مجموعہ میں بہت سی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو جناب وقار انبالوی کی قدرت نظم کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں محاورہ یا فن کی غلطیاں بھی اس میں ہیں لیکن نہ اسقدر کہ محاسن پر غالب آجائیں، یہ مجموعہ ایک روپیہ میں جناب وقار انبالوی سے مزنگ لاہور کے پتہ پر ملسکتا ہے -

نوائے تلخ اس کے مصنف کوئی صاحب مسٹر اشفاق ہیں اور تصنیف کا موضوع عورتوں کی معاشری اصلاح ہے - مصنف نے ایک خیالی جلسہ کر کے اس میں اس موضوع پر تقریر کی ہے اور پھر خواتین نے اس کا جواب دیا ہے - تقریر اپنی تفصیل کے لحاظ سے بہت جامع ہے اور اسی طرح عورتوں کا جواب بھی ہندوستان کی لنسائی ذہنیت کے اعتبار سے بہت مکمل - اس میں چند خطوط بھی شامل ہیں جن میں عورتوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے -

کتاب فی الجملہ مطالعہ کے قابل ہے اور چونکہ ہندوستان کی عورت کا مستقبل اس وقت کا نہایت اہم موضوع ہے اس لئے اس اشاعت کے برمحل ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا -

عربوں کی جہازرانی مجموعہ ہے سید سلیمان ندوی کے چار خطبوں کا جو اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن بمبئی نے کتابی صورت میں پیش کئے ہیں - ان خطبوں میں نہایت تحقیق و وضاحت کے ساتھ عربوں کی بحری خدمات اور فن جہازرانی کی ترقیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو اسقدر ربط و تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے - یہ کتاب اسوسی ایشن نے مجلد شائع کی ہے اور کاغذ وطباعت وغیرہ کے لحاظ سے نہایت دلکش ہے - ایک روپیہ میں سکرٹری اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن ۴۳ چوپاٹی روڈ بمبئی سے ملسکتی ہے -

یادگار اظہر

سید دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی کی منظوم مناجات ہے جس میں تمام مشہور اسمار الٰہی کے جمع کرنے کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے، زبان صاف ہے اور طرز بیان اثر آفریں۔ اخیر میں بعض تلمیحی اشعار کی شرح بھی شامل کردی ہے اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی۔۔۔

یہ کتاب نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے اور طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ اس کے مصنف مدرسہ دارالشفاء حیدرآباد میں فارسی پڑھاتے ہیں، جن صاحب کو ضرورت ہو اُن سے طلب کرلیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔

مصری افسانے

مصر کے مشہور فاضل و اہل قلم سید مصطفیٰ لطفی کے چند افسانے ہیں جنھیں قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے اُردو کے ملبوس میں پیش کیا ہے۔۔۔

تمام مصری اہل قلم اس خصوصیت میں مشترک ہیں کہ ان کی ہر تحریر کا منشار آزادی وطن، اور حُب قومی کا جذبہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ زیر نظر افسانے بھی ان جذبات سے مالامال ہیں، ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے گو زبان اور محاوروں کی غلطی سے پاک نہیں۔ مترجم نے اپنی تصویر تو اس میں شامل کردی ہے لیکن لطفی غریب کو اس قابل نہیں سمجھا۔

یہ کتاب مترجم سے مطبع مجتبائی میرٹھ کے پتہ پر ۸ر میں مل سکتی ہے۔

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

ترجمہ ہو خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ لکچروں کا جو انھوں نے چند ماہ پہلے جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دئے تھے۔ خالدہ ادیب خانم بین الاقوامی شہرت رکھنے والی خاتون ہیں اور بہ لحاظ علم و فضل خاص مرتبہ کی مالک سمجھی جاتی ہیں۔۔

انھوں نے اپنے خطبات میں ترکوں کی تمام تاریخ پر (عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک) وہ واقفکارانہ تبصرہ کیا ہے جو ایک غیر ترک سے کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ یہ خطبات انگریزی میں دئے گئے تھے، جنکا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے یعنی جیسا خطبہ دینے والا تھا ویسا ہی ترجمان اسکو نصیب ہوا۔ اسوقت مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترکی کو تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی اکثر حضرات ترکی کی تاریخ انقلاب اور اس کے حال و مستقبل سے دلچسپی لینے والے ملجاتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کی اشاعت نہایت برمحل ہے اور ہر اس شخص پر اسکا مطالعہ فرض ہے جو سلطنت ترکی سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اسے شائع کیا ہے اور دو روپیہ میں وہیں سے مل سکتی ہے۔

دو خدائی خدمتگار

ترجمہ ہے مہادیو ڈیسائی کی کتاب کا جس میں انھوں نے خان عبدالغفار خاں

اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں کے حالات خود انھیں کے زبانی قلمبند کئے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کو سیاسیات ہند میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اس لئے قدرتاً ہر شخص ان کے حالات معلوم کرنے کا متمنی رہتا ہے اور ضرورت تھی کہ ایسی کوئی کتاب مرتب کی جاتی۔ یہ حالات مہاتما گاندھی کی فرمایش پر مہادیو ڈیسائی نے انگریزی میں مرتب کئے تھے اور اب اس کا ترجمہ محمود علی خانصاحب نے کیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے۔ یہ کتاب بارہ آنے میں مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ملسکتی ہے۔

انجام ڈراما ہے جناب محمد مجیب بی اے (آکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی کا جو اس سے قبل رسالۂ جامعہ میں شائع ہو کر بہت پسند کیا جا چکا ہے۔

اس ڈرامہ کا موضوع یہ ظاہر کرنا ہے کہ طاعت و مذہب کا عام طور پر کتنا غلط مفہوم سامنے ہوتا ہے اور اس پردہ میں لوگ کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔

مجیب صاحب کو ڈرامہ لکھنے میں خاص سلیقہ حاصل ہے اور وہ اس فن کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر پلاٹ کو اس قدر دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ شروع سے اخیر تک ذوق کی آسودگی یکساں قایم رہتی ہے۔

اس کی قیمت بارہ آنے ہے اور مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے ملسکتا ہے۔

خوشۂ پرویں یعنی جناب فضل الدین فدا کے سو منتخب اشعار جنھیں سید کاظم دہلوی اڈیٹر کہکشاں نے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب کاظم اور پریمی جہاں آبادی نے حضرت فدا کی شاعری کے محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور کافی حسن ظن کے ساتھ۔

اس مجموعہ میں بہت کم شعر ایسے ہیں جو صحیح معنے میں شعر کہلائے جائیں، لیکن ان کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب فدا کی موجودہ شاعری اپنے اندر ایک اچھا مستقبل پوشیدہ رکھتی ہے اور اس لئے بہتر ہوتا اگر انتخاب کی اشاعت میں چندے اور توقف کیا جاتا۔ یہ انتخاب ۱۲ ر میں دفتر کہکشاں دہلی سے مل سکتا ہے۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس وقت یہ مجموعہ شائع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائے گی اور اسی وقت قیمت بھی اس کی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی ضخامت و قیمت کیا ہوگی۔ منیجر نگار - لکھنؤ

شیلے سے خطاب

نیاز صاحب قبلہ!

حُسنِ عقیدت کے جوش میں ذیل کی مختصر سی نظم جس میں شیلے سے زیادہ آپ کے مشن کی وضاحت و اشاعت ملحوظ ہے، ارسال خدمت کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف — رضوی

ترجمانِ روحِ فطرت، شاعرِ حسن و شباب
ساقیِ بزمِ محبت، ماہرِ چنگ و رباب!

دیکھ کر منظر تری چشمِ محبت پاش کا
ہو گیا کس ناز سے حُسنِ حقیقت بے حجاب!

موجِ دریا تیری فرقت میں سراپا جوش ہے
رنج دوری سے شعاعِ مہر لکیر اضطراب!

منکشف جبینِ جبیں سے تیری رازِ کائنات
آدمِ حُریت، اے ابجد نویسِ انقلاب!

کجروی تیری صراطِ منزلِ مقصود ہے
مصدرِ صد امن و راحت تیرا آئینِ "خراب"!

رعشہ بر اندام ہیں رسم و رواجِ دنیوی
کوئی دے سکتا نہیں تیرے سوالوں کا جواب!

تو ہوا کے بازوؤں پر مائلِ پرواز ہے
تکتے تکتے تیری صورت پھوٹ جاتا ہے حباب!

روح تیری کر رہی ہے غسل موجِ نور میں
اور تو لپٹا ہوا سوتا ہے زلفِ حور میں

رضوی اسراوی بی اے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے حسبِ ذیل قیمت پر علاوہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۳۲ء ستمبر ۳ر — سنہ ۲۴ء جنوری ۸ر — فروری ۴ر — مارچ ۸ر — اپریل ۸ر — مئی ۸ر — اگست ۸ر — سنہ ۲۶ء جنوری ۴ر —
مئی ۳ر — جون ۴ر — اکتوبر ۳ر — نومبر ۳ر — سنہ ۲۷ء مارچ ۳ر — اپریل ۶ر — مئی ۳ر — جون ۳ر — سنہ ۳۰ء مارچ ۸ر — مئی ۶ر —
ستمبر ۶ر — اکتوبر ۸ر — نومبر ۸ر — سنہ ۳۱ء جولائی ۴ر — اگست ۴ر — ستمبر ۴ر — اکتوبر ۴ر — نومبر ۴ر — دسمبر ۴ر — سنہ ۳۳ء فروری ۴ر
جولائی ۶ر — ستمبر ۶ر — اکتوبر ۶ر — دسمبر ۸ر — سنہ ۳۴ء فروری ۸ر — مارچ ۸ر — اپریل ۸ر — جون ۸ر — اکتوبر ۸ر —

دو روپیہ یا اس سے زیادہ قیمت کے پرچے وی پی کے ذریعہ سے بھی بھیجے جا سکتے ہیں، اس سے کم کے لئے پیشگی رقم ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر وصول ہونا ضروری ہے۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فائل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں۔ علاوہ محصول

منیجر نگار، لکھنؤ

سوگند!

ادھر بھی آ تجھے اپنے وقار کی سوگند!
خمارِ چشم و رخِ جلوہ بار کی سوگند!

نگاہِ لطف کے پرتو سے زندگانی دے
نیازِ عشق کے ہر اعتبار کی سوگند!

خرامِ ناز سے فتنوں کو دے نویدِ حیات
ادائے حسن وقدِ عشوہ کار کی سوگند!

ستارۂ سحری کی لطافتوں کی قسم!
فسانۂ شبِ مشکیں بہار کی سوگند!

سکونِ خاطرِ ناشاد بن خدا کے لئے
وفورِ دردِ شبِ انتظار کی سوگند!

شمیم نعمانی نیازی

نازنینانِ حرم

نگاہِ مست کا پیغام سن لیا میں نے
جہانِ قدس کا "الہام" سن لیا میں نے

حسین نغموں کی رو میں تجلیوں کا بہاؤ
فروغِ بادہ سے بیباکیٔ نظر کو لگاؤ

نگاہیں غرقِ شرابِ طہور کیا کہنا!
جوانیاں مئے و مستی سے چور، کیا کہنا!

نگاہ ناز نے ابرام کا پیام دیا
سرور رہے سے چھلکتا ہوا سا جام دیا

تمام جذبۂ پندارِ دل اُبھر آیا
جگر میں دردِ دو عالم شمیمؔ در آیا

"حرم" سے تیر چلائے ہیں نازنینوں نے
غریب جان کے لوٹا ہے مہ جبینوں نے

شمیم نعمانی نیازی

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہوگا

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ — ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب — اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ — ہر صنفِ شاعری کے بے مثل نمونے — ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے — ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری — قیمت فی پرچہ دو روپیہ نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں — نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

جستجو

اے مرے گریۂ خونناب کہاں پاؤں تجھے

شوق بیتاب ہے مدت سے ہم آغوش سکوں　　عشق ہشیار ہے نامحرم اسرار جنوں
اب نہ وہ جوشش تمنا میں نہ اشکوں میں وہ خوں　　سرنگوں ہیں مگر شوخ کے سارے افسوں

اے مرے گریۂ خونناب کہاں پاؤں تجھے

آکہ اب عشق ہے بیداریٔ مدہوشیٔ دل　　حرم ہوش میں مسدود ہے سرگوشیٔ دل
خندۂ زہر بن اور توڑ خنک جوشیٔ دل　　یاد بھی ہے تجھے وہ کیف ہم آغوشیٔ دل

اے مری مستیٔ نایاب کہاں پاؤں تجھے

بزم انجم مجھے پھر سر بگریباں دیکھے　　خندہ ماہ مرا سوز درخشاں دیکھے
دل کو طول شب خاموش پریشاں دیکھے　　آمد صبح مری دید کا ارماں دیکھے

اے مری کشمکش خواب کہاں پاؤں تجھے

چاند کی خواب اثر نظریں ہوں لب دوز نشاط　　برق کی زندہ دلی ہو طپش آموز نشاط
شعلۂ چشم فسونگر ہو چمن سوز نشاط　　اے محبت کی سحر، حاصل صدر روز نشاط

کاوشیں ہیں مری بیتاب کہاں پاؤں تجھے

سید رشید احمد صہبا واسطی

ڈراما اصحاب کہف

ابھی طیار نہیں ہوا ہے - اس لئے کوئی صاحب اس کا آرڈر ابھی نہ دیں یہ ڈراما ۳۱ جنوری ۳۶ء کے بعد شایع ہوگا اور صرف انھیں حضرات کو ملسکے گا جو نگار کے خریدار ہیں -

جو اصحاب اس کی قیمت بھیج چکے ہیں وہ اسے واپس لے سکتے ہیں اگر اتنا انتظار انھیں گوارا نہ ہو -

منیجر نگار - لکھنؤ

مُفلِس

رعد ہوں، برق ہوں، طوفان ہوں، پارہ ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے، وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے، وہ شرارہ ہوں میں

میری فریاد پر اہلِ دول انگشت بہ گوش؟
لا تبر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سرِ پرِ نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرت آبادِ امارت کا مکاں توڑوں گا

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

رسمِ کہنہ کو تہ خاک ملانے دے مجھے
برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
تفرقۂ مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں، آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

مخدوم محی الدین۔ بی۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن

گزشتہ جنوری کا نگار

اُردو شاعری کے لئے وقف تھا اور ۲۶۲ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ اربابِ قلم کی متفقہ رائے ہے کہ نگار کے اس اشاعت نے اُردو شاعری کے متعلق تمام تذکروں سے بے نیاز کر دیا ہے، چنانچہ بعض کالجوں میں صرف اسی کا پڑھانا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس نمبر کا تقریباً نصف حصہ اڈیٹر کے قلم کا ہے اور اپنی جامعیت و اندازِ بیان کے لحاظ بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے قبل مومن نمبر، ظفر نمبر وغیرہ نگار کے نکلے اور ختم ہو گئے۔ اب لوگ طلب کرتے ہیں اور وہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ چند دن کے بعد یہی حال اس نمبر کا بھی ہوگا۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ اس کی ایک جلد آپ طلب کر لیں۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ